اقبال

جادوگرِ ہندی نژاد

عتیق صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
نئی دہلی

© عتیق صدیقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر، نئی دہلی 110025، اردو بازار، دہلی 110006

پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

بار اول　　اگست ۱۹۸۰ء　　قیمت -/14

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی میں طبع ہوئی۔

سکندر علی وجد

کے لیے

روحِ اقبال کا پیغام

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اُٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اُگتے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

مُقتبس از شعاعِ اُمید (ضربِ کلیم) ۱۹۳۶ء

عنوانات

سخن نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم ۹
۱۔ خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرّہ دیوتا ہے ۲۳
۲۔ رہنے دو خم کے منہ پہ تم خشتِ کلیسا ابھی ۴۳
۳۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا ۵۵
۴۔ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں ۶۳
۵۔ اے تاجدارِ خطہ جنّت نشانِ ہند ۷۳
۶۔ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی! ۸۱
۷۔ اے زافسونِ فرنگی بے خبر! ۹۳
۸۔ اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۱۰۱
۹۔ بر لبِ او نالہ ہائے دردمند ۱۲۱
۱۰۔ سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر ۱۲۹

ضمیمے

اقبال: از شیخ عبد القادر ۱۳۳
ڈاکٹر محمد اقبال: از مولانا محمد علی ۱۴۵
کتابیات ۱۵۹

کچھ کتاب کے بارے میں

پچھلی پون صدی میں اقبال کی شاعری کے تقریباً تمام پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے، برصغیر ہند کے کسی شاعر کے بارے میں شاید ہی لکھا گیا ہو۔ لیکن اقبال کی سیاسی فکر اور ان کی سیاسی زندگی کو براہ راست موضوعِ قلم بنانے سے نہ جانے کیوں گریز کیا گیا ہے۔ اسی خلا کو پُر کرنے کی نیت سے آگے آنے والے صفحات میں اقبال کی شاعری کی روشنی میں ان کے سیاسی افکار و اعمال کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں شیخ عبدالقادر اور مولانا محمد علی کے دو اہم اور تاریخی نوعیت کے مضامین بھی ضمیمے کے طور پر شامل کیے گئے ہیں۔

اوّل الذکر اقبال کی شاعری اور حیات پر لکھا جانے والا پہلا اور سیر حاصل مضمون ہے، جو اردو شاعری کی بساط پر اقبال کے ورود کے ڈھائی تین ہی سال بعد ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا اور لکھنؤ کے ایک موقر ادبی جریدے، خدنگِ نظر (مئی ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا تھا، اور شاید اب تک نظروں سے اوجھل رہا ہے۔ موخر الذکر اقبال کی سیاسی زندگی اور سیاسی فکر پر لکھا جانے والا پہلا، اور شاید آخری، سیر حاصل مضمون ہے، جو اواخر اگست ۱۹۲۷ء میں روزنامہ "ہمدرد" (دہلی) کی پانچ مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوا تھا۔ آگے چل کر مضامینِ محمد علی میں بھی اگرچہ اسے شامل کیا گیا تھا، تاہم اقبال پر کام کرنے والوں نے

اس سے استفادہ کرنا غالباً اس لیے مناسب نہیں سمجھا کہ اس میں مولانا محمد علی نے اپنے مخصوص تند و ترش لہجے میں اقبال کی سیاسی زندگی کا تجزیہ کیا تھا۔ اس طویل مضمون کے ضروری اقتباسات ہی پیش کیے گئے ہیں۔

کتاب کے مواد کی فراہمی کے سلسلے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری اور اس کے اسٹاف کا میں حد درجہ ممنون ہوں۔ میری ضرورت کی تقریباً تمام کتابیں اسی کتب خانے میں مل گئیں اور وہاں کے جملہ کارکنوں نے کتابوں کی تلاش میں میرے ساتھ امکانی تعاون کیا۔

اس کتاب کے ناشر مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر شاہد علی خاں کا ممنونیت کے ساتھ ذکر کرنا ضروری ہے، جن کے پیہم تقاضوں نے یہ کتاب لکھوائی۔ لیکن اس کی اشاعت میں جو غیر معمولی تاخیر ہوئی اس کا شکوہ کرنے کا بھی مجھے حق ہے، تاہم اس حق کو میں استعمال نہ کروں گا، کیوں کہ طباعت کی تاخیر سے فائدہ اٹھا کر میں نے بھی ترمیم و اضافے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس سلسلے میں دلبر خاں رام پوری کا نام نہ لینا احسان ناشناسی ہوگی، جنھوں نے کتابت میں جتنی بھی کوتاہی و تساہلی برتی ہو، حذف و اضافے کی منزلیں بڑے صبر و تحمل سے طے کیں۔ بہر کیف یہ کتاب جو اقبال صدی کے ابتدائی دور میں شروع کی گئی تھی، ہندستان میں اقبال صدی کی اختتامی تقریب کے موقع پر پیش کی جا رہی ہے۔

عتیق صدیقی

جامعہ نگر۔ نئی دہلی
۲۵ر جولائی ۱۹۸۰ء

سخن نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں میں برصغیر ہند کے آسمان پر جو شخصیتیں آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں ان کی فہرست تو خاصی طویل ہے، لیکن ان میں چند ہی ایسی شخصیتیں ہیں جن کی چمک دمک ابھی تک باقی ہے۔ ان ہی میں ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی تھے۔

ہندستان کی جدید علمی، ادبی و ثقافتی تاریخ میں اقبال کا جو مقام ہے اس سے قطع نظر بیداری ہند کی تاریخ لکھنے والا کوئی بھی مورخ اقبال کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان کے ابتدائی دور کی شاعری نے مسلمان اور ہندو نوجوانوں کے دلوں کو یکساں طور پر گرمایا اور ان میں ہندستانی قومیت کا جذبہ پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے کہ اس بیسویں صدی میں سیاسی اعتبار سے جو متنازعہ فیہ شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں بھی اقبال کا نام سر فہرست ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اپنے اکثر و بیشتر معاصرین کی طرح اقبال بھی دہری شخصیت کے مالک تھے بلکہ اقبال میں یہ خصوصیت نسبتاً زیادہ کارفرما تھی، جس کا خود اقبال کو بھی احساس تھا، اور اس احساس ہی نے ان سے "بانگ درا" کا یہ آخری شعر کہلوایا تھا:

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا

اقبال نے یہی بات واضح تر الفاظ میں ۹ر اپریل ۱۹۰۷ء کو عطیہ فیضی سے اپنی دوسری ملاقات

میں کہی تھی :

"میری ذاتِ واحد میں دو شخصیتیں جمع ہوئی ہیں۔ ایک خارجی ہے، جو عملی ہونے کے علاوہ کاروباری طرز کی بھی ہے۔ دوسری داخلی شخصیت ہے جو خوابوں میں رہنے والے فلسفی اور صوفی کی سی ہے۔"[۱]

اقبال کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں، اور ان میں سے ہر پہلو مستقل کتاب کا موضوع بن سکتا ہے۔ وہ فلسفی تھے، مذہبیات سے انھیں قلبی لگاؤ تھا، سیاست سے بھی انھیں گہری دلچسپی تھی، لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ آگے آنے والے صفحات میں اگرچہ اقبال کی شاعری کے آئینہ میں اُن کے سیاسی افکار ہی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاہم ان کی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں پر سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا جن سے ان کی مجموعی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

فلسفہ

اقبال کو شاید اوائل عمر ہی سے فلسفے سے دلچسپی تھی۔ اس موضوع سے ان کے لگاؤ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی تعلیمی زندگی کے لیے اُنھوں نے اسی کا انتخاب کیا اور اسی کی تکمیل کے لیے یورپ کا سفر کیا۔ لیکن اقبال کو ان معنوں میں فلسفی کہنا خود اقبال کے ساتھ ناانصافی ہے جن معنوں میں کانٹ، ہیگل، مارکس اور نٹشے کو فلسفی کہا جاتا ہے۔ بایں ہمہ اقبال اور ان کی شاعری پر جو ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میں فلسفۂ اقبال کی تشریح و تعبیر میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ خود اقبال کا بھی دعوا تھا کہ :

ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

تاہم ان ہی کے الفاظ میں، خود ان کا اپنا "کوئی منظّم و مرتّب فلسفہ نہیں" تھا۔ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) میں شرکت کے لیے جب وہ لندن گئے تو وہاں کی انڈیا سوسائٹی نے ان کو دعوت دی کہ اپنے فلسفے اور شاعری پر وہ خود اظہارِ خیال کریں اسی موقع پر انھوں نے کہا تھا:

"بے شک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں، لیکن میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں ہے۔ البتہ فلسفے کے ایک مسئلے 'یعنی حیات بعد الممات' سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے[۲]"۔

لیکن فلسفے کے تمام مکاتیب کا اقبال نے اتنا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ کوئی منظّم و مرتّب فلسفہ نہ رکھنے کے باوجود انھیں فلسفی کہا جانے لگا تھا۔

مذہبیات

اسلامی علوم، خصوصاً قرآن کا اقبال نے غائر مطالعہ کیا تھا، بلکہ زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے اسلامیات ہی کے مطالعے میں صرف کیا تھا۔ ان کے اسی پہلو کو سب سے زیادہ توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ اب تک اقبال پر جو ان گنت کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر اسی موضوع کے گرد گھومتی ہیں۔ تاہم عالمِ دین ہونے کا انھیں دعوا نہیں تھا۔ مسلم لیگ (۱۹۳۰ء) کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے اس امر کی وضاحت ضروری سمجھی تھی کہ:

"اسلام، اس کی فقہ و سیاست، اس کی تاریخ اور اس کی ادبیات کے غائر مطالعے میں اپنی زندگی کا بڑا حصہ میں نے صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مختلف اوقات میں ظہور پذیر ہونے والی اسلامی روح کے ساتھ میرے ربطِ مسلسل نے اسلام کی عالم گیر حقیقت کے بارے میں ایک خاص قسم کی بصیرت مجھ میں پیدا کر دی ہے[۳]۔"

لیکن اپنی اس بصیرت پر اقبال کو کلی بھروسہ نہیں تھا۔ ایک موقع پر انھوں نے ایک خط کے جواب میں گاندھی جی کو لکھا تھا کہ "میں شرع کا ماہر نہیں ہوں"۔ اس فراخ دلانہ اعتراف سے قطع نظر، فقہی مسائل اکثر سید سلیمان ندوی یا مولانا آزاد سے وہ رجوع کیا کرتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی وہ یہی مشورہ دیتے تھے۔ ایک صاحب نے بعض مذہبی مسائل کی ان سے وضاحت چاہی تو اپنی رائے لکھنے کے بعد مکتوب الیہ کو یہ مشورہ بھی دیا:

"میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔"[5]

امریکہ کی کولمبیا یونیورسٹی سے ایک کتاب اسلام کے مالیاتی نظام پر شائع ہوئی، جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ "اجماع نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے"۔ اقبال نے اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا:

مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے؟ میں نے مولوی ابوالکلام صاحب کی خدمت میں بھی ایک عریضہ لکھا ہے۔"[6]

مذہبیات سے اقبال کی دلچسپی کا دائرہ اسلام اور اسلامی علوم ہی تک محدود نہیں تھا۔ دوسرے مذاہب سے خصوصاً ہندو مذہب اور سنسکرت زبان سے بھی انھیں طالب علمی کے زمانے سے دلچسپی رہی تھی۔ غالباً ہندو مذہب کے مطالعے ہی کے لیے انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی تھی۔ سنسکرت سے اقبال کے شغف کا ذکر کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر نے ۱۹۰۲ء میں لکھا تھا کہ اقبال "انگریزی دانی کے ساتھ ساتھ فارسی عربی سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اور مزید لطف یہ ہے کہ سنسکرت سے بھی ناآشنا نہیں"۔ عطیہ فیضی نے اقبال سے پہلی ملاقات (یکم اپریل ۱۹۰۷ء) کے بعد اپنے روزنامچے میں لکھا تھا کہ کھانے کی میز پر جو گفتگو ہوئی اس سے اندازہ ہوا کہ فارسی و عربی کے علاوہ سنسکرت میں بھی اقبال کو اچھی دستگاہ حاصل ہے۔[8] ہندو فلسفہ اور

سنسکرت سے اقبال کا شغف ممکن ہے کہ ان کی 'برہمن زادگی' کی دین رہا ہو جس کے وہ مدعی تھے

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی ؎ برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

یا یہ شعر :۔

میر و میرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند ؎ جز برہمن پسرے محرم اسرار کجا است

ہندو فلسفہ اور سنسکرت سے اقبال کی گہری دلچسپی کا اولین ثبوت ان کی نظم آفتاب (ترجمہ گایتری) سے ملتا ہے جو ایک طویل نوٹ کے ساتھ ۱۹۰۲ء کے رسالہ مخزن (لاہور) میں شائع ہوئی تھی اور 'بانگ درا' کے پہلے حصّے میں پائی جاتی ہے لیکن 'بانگ درا' میں شذرہ 'تمہیدی' حذف ہو گیا ہے۔ اس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں:

"ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں، جس کو گایتری کہتے ہیں۔ یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا ان تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدے سے اول اول انسان ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہو گا... یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک پائی جاتی ہے، اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت، اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا نہیں... اس مقام پر بظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ 'سوتر' استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث لفظ 'آفتاب' رکھا ہے۔ اس لفظ سے مراد اس آفتاب سے ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسب ضیا کرتا ہے۔ اکثر قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالی کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے۔ اللّٰہ نور السمٰوٰت والارض..."

"ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن اس خاص صورت حال میں دقت اور بڑھ گئی ہے۔ کیوں کہ اصل آواز کی موسیقیت اور طمانیت آمیز اثر، جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے۔ اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعرا ٹینی سن کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن میں حروفِ علّت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے، جس کا غیر زبان میں منتقل ہونا ناممکنات میں سے ہے ... [۹]"

مثنوی اسرارِ خودی کے پہلے اڈیشن کا دیباچہ اور جاوید نامہ کے بعض حصّے بھی ہندو فلسفے سے اقبال کی وابستگی کے ناقابلِ تردید ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ کچھ دنوں ہندو فلسفے کے مطالعے میں مستغرق رہنے کے بعد اقبال نے "ایک دوست کو بتایا کہ اس فلسفے کے مطالعے سے طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا اور شانتی کے معنی سمجھ میں آ گئے۔ [۱۰]"

سیاست

ملکی سیاست سے بھی اقبال کو طالب علمی ہی کے زمانے سے براہ راست اگر نہیں تو بالواسطہ دلچسپی ضرور رہی تھی۔ اس کا اندازہ ان کی قومی یا وطنی نظموں سے ہوتا ہے۔ جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اُنھوں نے لکھی تھیں۔ اس خیال کی تائید ان کی اوّلین تالیف 'علم الاقتصاد' سے بھی ہوتی ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ لیکن سیاست سے ان کو صرف نظریاتی دلچسپی رہی۔ اُنھوں نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان وسیع معنوں میں وہ سیاسی لیڈر نہ بن سکے جن معنوں میں آزاد، گاندھی، جناح، نہرو اور ان کے

دوسرے معاصرین تھے۔ زندگی کے آخری دور میں عملی سیاست داں کی حیثیت سے اُنھیں دو موقعوں پر کام کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلا موقع اس وقت آیا جب وہ ۱۹۲۷ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اور دوسرا موقع وہ تھا جب اُنھیں ۱۹۳۱ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانا پڑا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں موقعوں پر شدّت سے محسوس کرلیا کہ قدرت نے ان کو اس قسم کے ادنا کاموں کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ یہی بات اقبال کے ایک ہم پیشہ عزیز دوست، بلکہ یارِ غار، مرزا جلال الدین بیرسٹر نے واضح تر الفاظ میں کہی ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سیاسیات میں عملی طور پر کبھی داخل نہیں ہوئے۔ کیوں کہ ان کی طبیعت اس زحمت سے ہمیشہ نفور رہی... ان کی طبیعت کو فطری طور پر سیاست سے مناسبت نہ تھی۔ اُنھوں نے اپنی زندگی بھر میں کبھی بھی سیاسی قائد بننے کی کوشش نہیں کی... اقبال کا تفکّر و تدبّر محض اسی اسلامی سیاست تک محدود تھا جس کا ذکر کلامِ پاک میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اسی سیاست کو اُنھوں نے اپنا موضوعِ سخن بنایا تھا... چنانچہ کئی سال کے بعد جب کونسل کی رکنیت کے لیے اُنھیں آمادہ کیا گیا تو ان کے مشیران کار اس امر کو نظر انداز کر گئے کہ اقبال کی طبیعت کو اس جنس سے کوئی نسبت نہیں ہے..."[۱۲]

پنجاب کونسل کی ممبری کی نوعیت تو صوبائی سیاست کی تھی، لیکن اقبال نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (۱۹۳۰ء) کی صدارت کی، ۱۹۳۰ء ۱۹۳۱ء میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں حصہ لیا اور ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کی۔ ان کے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت کو تو ہماری تاریخ میں بوجوہ غیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اور آج اسے تحریکِ پاکستان کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے، اگرچہ یہ محلِ نظر ہے، کیوں کہ "برطانوی ہند" میں اقبال جس "مسلم ہند" کا قیام چاہتے

تھے، وہ پاکستان کے تصوّر سے بالکل مختلف تھا۔
زندگی کے آخری چند برسوں میں اقبال کے سیاسی افکار میں ایک اہم انقلاب رونما ہوا۔ سوشلزم سے اور سوویٹ یونین سے انھیں اس حد تک گہری دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ لوگوں نے ان کے لیے "اسلامی سوشلسٹ" کی اصطلاح وضع کر ڈالی۔ اقبال کی شاعری نیز دوسرے ماٰخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عصر حاضر کے انسان کے معاشی مسائل صرف سوشلزم ہی سے حل ہو سکتے ہیں، اور سوشلزم کو وہ عین اسلام سمجھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندستان میں سوشلسٹ پارٹی کا قیام ایک مستقل سیاسی پارٹی کی حیثیت سے عمل میں آئے اور جب ایسا نہیں ہو سکا تو اس کے خلاف شدید غم و غصّے کا اظہار کیا۔

شاعری

خود اقبال شاعر ہونے کے منکر تھے۔ انھیں ان لوگوں سے شکایت تھی جو انھیں شاعر سمجھتے تھے۔ یا ان کے کلام میں "رنگ و آبِ شاعری" کے متلاشی تھے۔ اقبال نے ۱۹۱۳ء میں عین اس زمانے میں جب ان کی شاعرانہ شہرت و عظمت تیزی سے عروج کی منزلیں طے کر رہی تھی خواجہ حسن نظامی کو لکھا تھا کہ:

"میں اپنے آپ کو شاعر تصوّر نہیں کرتا، اور نہ کبھی بحیثیت فن اس کا مطالعہ کیا ہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ صفِ شعرا میں بیٹھوں ۱۳"

فن شاعری کا مطالعہ تو اقبال نے شاید کبھی بھی نہیں کیا، تاہم وہ شاعر اور باکمال شاعر تھے۔ ان کے عہد کا کوئی بھی شاعر ان کا مدِمقابل ہونے کا مشکل ہی سے دعوا کرنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ اقبال کی وفات پر ابوالکلام آزاد نے کہا تھا، اور صحیح کہا تھا کہ "جدید ہندستان ان سے بڑا شاعر نہیں پیدا کر سکتا ۱۴"
اقبال نے جو ابتدائی زمانہ پایا تھا وہ ہماری تاریخ کا بدترین دور بھی تھا، اور

بہترین عہد بھی۔ اس وقت ملک اگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، تو غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا عزم بھی اسی دور میں پیدا ہوا۔ اور یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اقبال کے ابتدائی دور کی نظموں نے اس عزم کو پختہ تر کرنے کی خدمت انجام دی۔

اقبال نے دس شعری مجموعے ہمارے لیے چھوڑے ہیں: مثنوی اسرارِ خودی (۱۹۱۵ء) رموزِ بے خودی (۱۹۱۸ء)، پیامِ مشرق (۱۹۲۳ء)، بانگِ درا (۱۹۲۴ء) زبورِ عجم (۱۹۲۷ء)، جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) بالِ جبریل (۱۹۳۵ء) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق اور مثنوی مسافر (۱۹۳۶ء)، ضربِ کلیم (۱۹۳۶ء) ارمغانِ حجاز (۱۹۳۸ء) ان میں سے اول الذکر نو مجموعے اقبال کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے۔ آخری مجموعہ ان کی وفات کے سات مہینے بعد چھپا۔

بانگ درا جو ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی تھی اسے اقبال نے، بہ قیدِ سنین، تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس کا مقصد اپنی شاعری کے تین مندرجہ ذیل ادوار قائم کرنا تھا۔ ان میں سے ہر دور ان کی فکر کے ارتقا کی نشان دہی کرتا ہے۔

پہلا دور ابتدا سے ۱۹۰۵ء تک: اس دور میں اقبال کی شاعری پر گہرا وطنی یا قومی رنگ چھایا رہا۔

دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک: یہ زمانہ اقبال نے یورپ میں بسر کیا اس دور میں جو نظمیں انھوں نے کہیں، وہ گنتی میں بہت کم ہیں۔ اور ان میں قومی رنگ کی کوئی نظم نہیں ملتی۔ البتہ بعض ایسی نظمیں ضرور ملتی ہیں، جن میں آگے آنے والے تیسرے دور کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے 'بانگ درا' کی اشاعت ۱۹۲۴ء تک: یہ اقبال کی ملی شاعری کا دور تھا۔ اسی زمانے میں 'بانگ درا' کے علاوہ ان کی دو فارسی مثنویاں اور 'پیام مشرق' کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس دور کی بیش تر اردو اور فارسی نظموں کے

مخاطب مسلمان تھے۔ اکثر نظموں میں انسان دوستی اور اتحاد اسلامی کی بلند و بانگ دعوت اور محنت و سرمایہ کی آویزش کی دبی دبی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں تک اتحادِ اسلامی کی دعوت کا تعلق ہے، اقبال کے کلیات فارسی کے مرتب آقائے احمد سروش نے اپنے طویل مقدمے میں یہ بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ:

> اقبال کا پیغام محبت برائے بشریت تھا۔ لیکن ان کا ہدف عالمِ اسلام کا اتحاد تھا۔ ان سے پہلے عبدالرحمٰن کواکبی اور جمال الدین افغانی جیسے بزرگ بھی عالم اسلام کے اتحاد کے لیے کوشاں رہے تھے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا[15]"

اقبال کو بھی شاید اس کا احساس ہو گیا تھا، چنانچہ ۱۹۲۴ء کے بعد ان کی شاعری کا جو دور شروع ہوا، اس میں اتحاد اسلامی کی لَے مدّھم پڑ گئی اور عالم انسانیت کے وسیع تر اتحاد کا، نیز سوشلزم کا، سر تیز تر ہو گیا۔ اس کی واضح مثالیں زبورِ عجم ۱۹۲۷ء میں ملتی ہیں۔

اقبال کی شاعری کا پانچواں دور جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کی اشاعت سے شروع ہو کر ان کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔ ہماری تاریخ کا یہ وہ دور ہے جب ہندستان پر برطانوی سامراج کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی اور روز بروز کم زور تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال نے اقبال میں بھی بے باکی و بے خوفی پیدا کی۔ چنانچہ ان کے اس دور کے کلام میں ہندستان کی غلامی کے خلاف احتجاج کو اور آزادی کی تڑپ کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔

اقبال ایک انسان

راقم الحروف نے ایک مضمون میں اقبال پر پاکستان سے شائع ہونے والی مطبوعات کے ضمن میں لکھا تھا کہ پاکستان میں اقبال کے ساتھ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا ہے کہ علامہ کی مسند سے اٹھا کر انھیں 'حکیم الامت'، ہی نہیں بلکہ 'علیہ رحمۃ' بنا دیا گیا ہے۔

جس کے صرف مناقب ہی لکھے جا سکتے ہیں اور اس کے آگے قدم بڑھانے کی وہی ہمت کر سکتا ہے، جسے جان و دل عزیز نہ ہو اور جو یہ کہنے کی ہمت رکھتا ہو کہ:

قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل [۱۶]"

متذکرہ بالا مضمون جب لکھا گیا تھا اُس وقت میرے پیشِ نظر اقبال کے عزیز دوست مرزا جلال الدین کا وہ مقالہ نہیں تھا، جو اقبال کی وفات کے چند ہی سال بعد لکھا گیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے خصوصیت سے اس پہلو پر زور دیا تھا کہ اقبال 'ابنِ آدم' تھے اور 'خوئے آدم' بھی اُنھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کی عظمت اسی میں ہے کہ اُنھیں انسان کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔

"اقبال آخر انسان تھے۔ پیغمبرانہ اعجاز رکھنے کے باوجود پیغمبر نہیں تھے۔ اس لیے ان کو ایسی باتوں سے معرا سمجھنا جو بشریت کا لازمہ اور انسانیت کا خاصہ ہیں ایک ایسا تمسخر انگیز دعوا ہے جس میں نہ تو حقیقت کو دخل ہے، نہ خود ڈاکٹر صاحب کی روح کے لیے مسرت کا سامان موجود ہے۔ اقبال نہ زاہدِ خشک تھے، نہ ریاکار صوفی.... ان کے چہرے پر تقدس کا جو ہالہ ہر وقت نظر آتا تھا اُس سے یہ کسی طور پر لازم نہیں آتا کہ اُنھیں ان کے اصلی مرتبہ سے محروم کر کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام کے زمرے میں شامل کر لیا جائے حالانکہ ان سے علاحدہ رہ کر بھی اقبال کی عظمت و وقار میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی۔.."

ہندستان پرستی

اقبال کی شاعری کا ایک نہایت اہم اور دل چسپ پہلو یہ بھی ہے کہ پہلے دور کی جارحانہ وطن پرستی کو ترک کرنے کے بعد بھی ہندستان کی دھرتی کے ساتھ اقبال

کا لگاؤ باقی ہی نہیں رہا بلکہ آخری عمر میں اور بھی گہرا ہو گیا۔ 'بانگ درا' کے دوسرے حصے سے لے کر ارمغانِ حجاز تک ان کے ہر مجموعۂ کلام میں ہندستان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں ان کی محبت کا اور ہندستان کی آزادی کی تڑپ کا اظہار ہوتا ہے۔ اپنے آخری مجموعۂ کلام 'ارمغانِ حجاز' میں بڑے کرب کے ساتھ انھوں نے کہا تھا:

شب ہندی غلاماں را سحر نیست بایں خاک آفتابے را گذر نیست

فکرِ اقبال کا یہ وہ پہلو ہے جسے ہندستان میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ رجحان اقبال کی وفات کے چند ہی سال بعد ظاہر ہونے لگا تھا، اور ان کے ابتدائی دور کی وطنی شاعری کو ان کے "ناپختہ خیالات" سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اسی رجحان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے، آج سے ۳۲ سال قبل کہا تھا:

"جو اصحاب قرآن شریف کی بعض آیات کو، جو بہ ظاہر متناقض نظر آتی ہیں، بے باکانہ منسوخ قرار دے دیتے ہیں، ان سے کچھ بعید نہیں ہے کہ اقبال کی ان نظموں کو بھی قابلِ تنسیخ قرار دیں۔ بلکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر بھی رہے ہیں اور یہ فرما رہے ہیں کہ وہ شاعر کے بالکل ابتدائی دور کے ناپختہ خیالات تھے۔"[۱۸]

اقبال کے ساتھ جو زیادتیاں اور ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھیں 'شاعرِ اسلام' بنا کر ان کی حیثیت کو محدود کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں اقبال کی وفات کے فوراً بعد تیج بہادر سپرو مرحوم نے یہ بڑے پتے کی بات کہی تھی، جس سے آج بھی چشم پوشی کی جا رہی ہے:

"اقبال کے ساتھ وہ لوگ بہت بے انصافی کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ محض اسلامی شاعر تھا۔ یہ کہنا اس کے دائرہ اثر کو محدود

کرتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اسلامی فلسفہ، اسلامی عظمت اور اسلامی تہذیب پر بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن کسی نے آج تک ملٹن کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ عیسائی شاعر تھا، یا کالی داس کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہندو مذہب کا شاعر تھا، اس کے اثر کو نہ محدود کیا نہ کسی مذہب کے آدمیوں نے اس کی قدردانی میں کمی کی!![19]"

مندرجہ بالا اقتباس میں جس رجحان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، قیام پاکستان کے بعد اس نے تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اقبال کی وطنی شاعری کا، یا ان کی شاعری کے ہندستانی عناصر کا ذکر کرنا بھی وہاں خلاف مصلحت سمجھا جاتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم ہی ایک ایسے پاکستانی مصنف تھے، جنھوں نے اقبال کی ہندستانی قومی شاعری کا فیاضی سے ذکر کیا ہے لیکن ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز تھی۔

یہ کام پاکستان کے کرنے کا نہیں، ہمارے کرنے کا تھا، جو ہم نہیں کر سکے۔ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کے کلام میں ہندستانی عناصر کی جستجو کی، مگر ان کے مصرعے کو کسی نے اٹھایا ہی نہیں۔ انھوں نے اپنے لیے دوسرے میدان تلاش کر لیے اس کوتاہی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو ہم نے نظر انداز کیا ہے کہ اقبال اصلاً ہندستانی تھے۔ ہندستان میں انھوں نے جنم لیا تھا اور ہندستان ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اپنی وفات سے پانچ ہی ہفتے قبل اقبال نے مسئلہ قومیت کی بحث کے سلسلے میں اعتراف کیا تھا کہ:

"ہم سب ہندی ہیں اور ہندی کہلاتے ہیں۔ ہم سب کرۂ ارضی کے اس حصے میں بود و باش رکھتے ہیں جو ہندستان کے نام سے موسوم ہے۔[20]"

حوالے

IQBAL : Atia Begum, p. 15. ۱۔

۲۔ روزنامہ انقلاب (لاہور) : ۲۲؍ اکتوبر ۱۹۳۱ء : بہ حوالہ سفرنامۂ اقبال : مرتبہ حق نواز : ص ۱۰۸

۳۔ SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL: Edited by Shamloo, p.3

۴۔ GANDHI PAPERS(S. No.7330): Gandhi Samarak Nidhi, New Delhi

۵۔ خطوطِ اقبال : مرتبہ رفیع الدین ہاشمی : ص ۱۶۷

۶۔ اقبال نامہ (اول) مرتبہ شیخ عطاء اللہ : ص ۳۳۔ ۱۳۲

۷۔ خدنگ نظر (لکھنؤ) جلد ۵ نمبر ۶ : مئی ۱۹۰۲ء : ص ۷

۸۔ Atia Begum, Op. cit, p. 17

۹ بہ حوالہ باقیاتِ اقبال : مرتبہ عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی : ص ۳۶۔ ۱۳۴

۱۰۔ خدنگ نظر (لکھنؤ) : متذکرہ : ص ۱۰

۱۱۔ اقبال کے آخری دو سال : ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی : ص ۱۴

۱۲۔ میرا اقبال : مرزا جلال الدین : مشمولہ ملفوظات : مرتبہ محمود نظامی : ص ۵۔ ۶۴

۱۳ اقبال نامہ (دوم) ص ۳۶۷

۱۴۔ POET OF THE EAST: Abdullah Anwar Beg, p.59

۱۵۔ کلیاتِ اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری : مرتبہ احمد سروش، مطبوعہ تہران : ص ۵۹

۱۶۔ رسالہ جامعہ (نئی دہلی) اقبال نمبر مارچ ۱۹۷۸ء

۱۷۔ میرا اقبال : مرزا جلال الدین : مشمولہ ملفوظات : ص ۸۴

۱۸۔ اقبال اور قومیت : شوکت سبزواری : رسالہ جامعہ (نئی دہلی) اپریل ۱۹۴۵ء ص ۴

۱۹۔ رسالہ اردو (اقبال نمبر ۱۹۳۸)

۲۰۔ ملت اور وطن۔ مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کی بحث : ص ۱۹

خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اپنے ابتدائی دَور کی نظموں میں، جو 'بانگِ درا' کے پہلے حصے میں پائی جاتی ہیں اور ۱۹۰۵ء تک کے زمانے پر محیط ہیں، اقبال نے جس والہانہ انداز میں وطن کی عظمت کے گیت گائے اور جس شدت کے ساتھ وطن سے محبت و عقیدت کے راگ الاپے اس نے، بجا طور پر، اُنھیں شاعرِ قوم بنا دیا۔ ہمالہ، ترانۂ ہندی، ہندستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، اور ان کی اسی طرح کی دوسری نظمیں تھیں بھی اسی قابل کہ ان کے سر پر قومی شاعری کا تاج رکھا جائے۔

وطن سے اقبال کی محبت کا اولین، اور شاید مُوثر ترین مظاہرہ 'ہمالہ' میں نظر آتا ہے۔ "یہ نظم ایک وطن پرست انسان کے مردہ حسیات کو زندہ کرنے کے لیے برقی رَو کا کام کرتی ہے۔" یہی بانگ درا کی پہلی نظم ہے اور جذبات، نیز شاعرانہ بلند پروازی کے اعتبار سے ہمالہ پہاڑ سے کم بلند نہیں ہے۔ بانگ درا کا پہلا اڈیشن ۱۹۲۴ء میں جب شائع ہوا تو اقبال کی شاعری ملّی رنگ اختیار کر چکی تھی، لیکن ان کی نظروں میں اس نظم کی اہمیت اور قدر و قیمت کم نہیں ہوئی تھی۔ غالباً اسی بنا پر اُنھوں نے بانگ درا میں اسی کو پہلی جگہ دی۔ اس کے دو ابتدائی بند یہ ہیں:

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیمِ طورِ سینا کے لیے

تو تجلّی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو — پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جس کا ہو، وہ دیواں ہے تو — سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

آخری بند ہے:

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سُنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلّف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ہمالہ کے بعد اقبال کے ابتدائی دور کی دوسری اہم نظم 'صدائے درد' ہے جس میں اس دَور کے ہندستان کی حالت کا نہایت موثر نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کا ابتدائی حصّہ یہ ہے:

جَل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا، یاں تو اِک قربِ فراق آمیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

اسی سلسلے کی ایک نظم 'تصویرِ درد' بھی ہے۔ جس میں ملک کی حالت پر آنسو بہاتے ہوئے اہلِ ملک کو اقبال نے متنبہ کیا تھا:

رلاتا ہے ترا نظّارہ اے ہندوستاں! مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے ترا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا، کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونیوالا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسی نظم کے کچھ اور اشعار یہ ہیں:

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑونگا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا

اسی دور میں "سر سید کی لوحِ تربت" سے بھی اقبال کو جو پیغام ملا، وہ یہ تھا:

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیمِ دیں ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

اس نظم کے بہت سے اشعار 'بانگِ درا' میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔ آخری حذف شدہ شعر یہ ہے:

از شرابِ حبِّ ہم جنسان خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش

قومی شاعر کی حیثیت سے اقبال کے نام کو زندہ رکھنے والی نظموں میں ان کا ترانۂ ہندی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، وہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندستان میں آج بھی اقبال کے اس ترانے کو 'قومی گیت' کی حیثیت حاصل ہے اور قومی اجتماعات میں اسی حیثیت سے گایا بھی جاتا ہے۔ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کے بارہ بجے جب ہندستان کی غلامی کے خاتمے کا اور آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس موقع پر ہندستانی پارلیمنٹ کے ایوان میں جن گن من کے ساتھ اقبال کا ترانہ بھی گایا گیا۔ اسی طرح آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر حکومت ہند کی وزارت نشر و اشاعت نے کثیر رقم صرف کر کے اس کی دھن بنوائی تھی۔ اس ترانے کے شیدائیوں میں گاندھی جی بھی تھے۔ اقبال کی وفات کے بعد ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا۔

"ڈاکٹر اقبال کے بارے میں میں کیا لکھوں۔ لیکن اتنا تو میں کہہ

سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندستان ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا، اور یرودہ جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"[۲]

ایک موقع پر گاندھی جی نے اردو ہندی کی نزاع کے سلسلے میں اس ترانے کو "ہندستان کی قومی زبان" کا نمونہ کہا تھا۔

"کون ایسا ہندستانی دل ہے، جو اقبال کا 'ہندستان ہمارا' سُن کر دھڑکنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔ اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندستانی ہے ؟ یا اردو ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندستان کی قومی زبان نہیں ہے۔"[۳]

آزادی ملنے کے بعد بھی اس ترانے کی یاد گاندھی جی کے دل میں باقی رہی ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو نوا کھالی کے ایک گاؤں میں جہاں ہندستان و پاکستان کے جھنڈے دوش بدوش لہرا رہے تھے، ان کی پرارتھنا سبھا میں یہ ترانا گایا گیا۔ آخر میں گاندھی جی نے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دہراتے ہوئے دعا کی تھی کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اب ہم کبھی تلوار ہاتھ میں نہ لیں۔[۴]

اس ترانے کی شانِ نزول بھی ترانے سے کم شان دار نہیں ہے، جو اقبال کی مجلس کے ایک حاضر باش محمد عمر (نور الٰہی ' مصنف ناٹک ساگر)، کے حوالے سے سید ظفر ہاشمی نے بیان کی ہے:

"لالہ ہردیال جو ہندستان سے جلاوطن ہوکر کچھ عرصے تک امریکہ میں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دُکھ جائے تری تقریر سے

اس نظم کے بہت سے اشعار 'بانگِ درا' میں جگہ نہیں پا سکے تھے۔ آخری حذف شدہ شعر یہ ہے:

از شرابِ حبِّ ہم جنسان خود مستانہ باش
شعلۂ شمعِ وطن را صورتِ پروانہ باش

قومی شاعر کی حیثیت سے اقبال کے نام کو زندہ رکھنے والی نظموں میں ان کا ترانۂ ہندی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی، وہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

ہندستان میں آج بھی اقبال کے اس ترانے کو 'قومی گیت' کی حیثیت حاصل ہے اور قومی اجتماعات میں اسی حیثیت سے گایا بھی جاتا ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی شب کے بارہ بجے جب ہندستان کی غلامی کے خاتمے کا اور آزادی کا اعلان کیا گیا تو اس موقع پر ہندستانی پارلیمنٹ کے ایوان میں جن گن من کے ساتھ اقبال کا ترانہ بھی گایا گیا۔ اسی طرح آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر حکومت ہند کی وزارت نشر و اشاعت نے کثیر رقم صرف کر کے اس کی دھن بنوائی تھی۔ اس ترانے کے شیدائیوں میں گاندھی جی بھی تھے۔ اقبال کی وفات کے بعد ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا۔

"ڈاکٹر اقبال کے بارے میں میں کیا لکھوں۔ لیکن اتنا تو میں کہہ

سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم 'ہندستان ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا، اور یرودہ جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے۔ اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔"[۲]

ایک موقع پر گاندھی جی نے اردو ہندی کی نزاع کے سلسلے میں اس ترانے کو "ہندستان کی قومی زبان" کا نمونہ کہا تھا۔

"کون ایسا ہندستانی دل ہے، جو اقبال کا 'ہندستان ہمارا' سُن کر دھڑکنے نہیں لگتا اور اگر کوئی ایسا دل ہے تو میں اسے اس کی بدنصیبی سمجھوں گا۔ اقبال کے اس ترانے کی زبان ہندی یا ہندستانی ہے ؟ یا اردو ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ہندستان کی قومی زبان نہیں ہے۔"[۳]

آزادی ملنے کے بعد بھی اس ترانے کی یاد گاندھی جی کے دل میں باقی رہی ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو نواکھالی کے ایک گاؤں میں جہاں ہندستان و پاکستان کے جھنڈے دوش بدوش لہرا رہے تھے، ان کی پرارتھنا سبھا میں یہ ترانا گایا گیا۔ آخر میں گاندھی جی نے

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

دہراتے ہوئے دعا کی تھی کہ اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے اب ہم کبھی تلوار ہاتھ میں نہ لیں۔[۴]

اس ترانے کی شانِ نزول بھی ترانے سے کم شان دار نہیں ہے، جو اقبال کی مجلس کے ایک حاضر باش محمد عمر (نور الٰہی) مصنف ناٹک ساگر، کے حوالے سے سید ظفر ہاشمی نے بیان کی ہے:

"لالہ ہردیال جو ہندستان سے جلاوطن ہو کر کچھ عرصے تک امریکہ میں

مقیم رہے تھے … گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم، اے کے طالب علم تھے۔ یہ ہردیال عجیب خلقت کا آدمی تھا اور عجائبات قدرت میں شمار ہوتا تھا۔ اگر کسی اور زمانے میں ہوتا تو کیا عجب ہے کہ رشی یا مُنی کا دعوا کرتا۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جو کچھ بھی ایک نظر پڑھ لیتا وہ کبھی نہ بھولتا۔ ہردیال نہ صرف اپنے کالج بلکہ دوسرے کالجوں کے طلبہ میں بھی بڑا ہر دلعزیز تھا۔ لاہور میں ۱۹۰۴ء میں صرف ایک کلب 'وائی، ایم، سی، اے' تھا۔ ہردیال بھی اس کا ممبر تھا۔ طبعاً وطن دوست اور قوم پرست تھا۔ ایک دن سکریٹری کلب سے کچھ جھڑپ ہو گئی۔ بات نے طول پکڑا اور ہردیال نے 'ینگ مینز انڈین اسوسی ایشن' کی داغ بیل ڈال دی۔ تمام کالجوں کے طلبہ ہردیال کے ہم نوا ہو گئے۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب علامہ اقبال گورنمنٹ کالج میں لکچرر تھے۔ ان کی طبع جولانی پر تھی اور ان کی لازوال شاعری کا آغاز ہو رہا تھا۔ ہردیال سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے ہردیال نے اپنے کلب کا افتتاحی جلسہ کیا تو علامہ کو صدارت کے لیے مدعو کیا، جو انھوں نے قبول کر لیا۔ تین بجے شام کو جلسہ کرنے کا فیصلہ ہوا اور چھ بجے شام کو جلسہ شروع ہو گیا۔ جب جلسہ شروع ہوا تو اقبال نے بجائے خطبۂ صدارت کے:

'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'

پڑھنا شروع کیا۔ حاضرین پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ علامہ ترنم سے پڑھ رہے تھے اور لوگ جھوم رہے تھے، مگر ہم لوگ جو روزانہ بلاناغہ شام کو حاضرِ خدمت ہوتے تھے، حیران تھے کہ یہ نظم کب کہی گئی۔ وہ

نظم پڑھتے گئے اور میں پنسل سے کاغذ پر اُتارتا چلا گیا ... ہوسٹل میں پہنچ کر اس نظم کو صاف کر کے لکھا۔ ان دنوں مولوی عبدالحلیم شرر اپنے رسالہ "اتحاد" میں ہندو مسلم اتحاد کے گیت الاپ رہے تھے، میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ نظم اشاعت کے لیے بھیج دی ... ایک دن میں حسبِ معمول آپ کے (اقبال کے) مکان پر گیا ... محفل پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور علامہ غصے کا مجسّمہ بنے بیٹھے تھے، میں نے چپکے چپکے پوچھا کہ کیا ماجرا ہے، تو معلوم ہوا کہ جو نظم کلب میں پڑھی گئی تھی، اُسے کسی نے رسالہ 'اتحاد' لکھنؤ میں شائع کرا دیا ہے۔ اس میں بہت سی غلطیاں کھینچنے والے کی بدولت وارد ہو گئی ہیں، اور ان غلطیوں کو سامنے رکھ کر مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ "اردوئے معلیٰ" میں اہلِ پنجاب کو جی بھر کر جلی کٹی سنائی ہیں۔ اب اس بے چارے فریندہ کو صلواتیں سنائی جا رہی ہیں ...۵"

مندرجہ بالا اقتباس کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے ایک تو اس سے ہماری معلومات میں یہ اضافہ ہوتا ہے کہ لالہ ہردیال جو آگے چل کر ہمارے ملک کے بہت بڑے انقلابی بننے والے تھے، ان کے اقبال سے دوستانہ تعلقات تھے

لالہ ہردیال ۱۸۸۴ء میں دہلی کے ایک متوسط درجے کے کائستھ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔ بارہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کیا۔ بی۔ اے پنجاب یونیورسٹی سے کیا، اور دونوں امتحانوں میں اول آئے۔ ۱۹۰۳ء میں لاہور گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں اور پھر تاریخ میں ایم۔ اے کیا۔ ان امتحانوں میں بھی اول آئے۔ اسی بنا پر انھیں دو سو پاونڈ سالانہ کا سرکاری وظیفہ ملا۔ ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے۔ آکسفورڈ سے بی۔ اے آنرز اور لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔

۱۹۰۸ء میں ہندستان واپس آئے، لیکن اسی سال واپس چلے گئے۔ یہی ۱۹۱۰ء میں بھی ہوا، اس کے بعد وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ یورپ میں دوسرے ہندستانی انقلابیوں کے ساتھ برطانوی اقتدار کا مقابلہ کرتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں امریکہ میں 'غدر پارٹی' کی داغ بیل ڈالی، جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کی حریف طاقتوں کے ساتھ مل کر ہندستان کی آزادی کی جدوجہد کی۔ ۱۹۳۹ء میں امریکہ ہی میں وفات پائی۔

دوسری دلچسپ بات اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ 'ترانۂ ہندی' کی اشاعت نے یوپی اور پنجاب میں ادبی محاذ آرائی کی شکل پیدا کر دی تھی۔ عبدالحلیم شرر نے 'ترانۂ ہندی' کے بعض اشعار پر 'دل گداز' میں اعتراض کیا۔ اس کا جواب 'مخزن' (لاہور) میں شائع ہوا۔ اس پر حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں لکھا کہ مخزن اکتوبر ۱۹۰۴ء سے معلوم ہوا کہ

"بعض درشت زبان اور ناواقف . . نکتہ چینی کا جواب سب و شتم سے دینا چاہتے ہیں۔ اہل پنجاب میں جو لوگ منصف مزاج اور صحتِ زبان کے خواستگار ہیں . . . نکتہ چینیوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر اقبال صاحب نے ایک غزل کے مقطع میں لکھا تھا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا

'دل گداز' نے اعتراض کیا کہ اس شعر کے آخر میں 'ہمارے' کے بجائے 'اپنا' ہونا چاہیے۔ اور اقبال نے اب اس کو بدل کر مخزن میں اس طرح چھپوایا:

اقبال کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

اس کے ساتھ ہی حسرت نے یہ ضرور لکھا تھا کہ "حضرت اقبال کی نظم روز بروز زبان کے لحاظ سے صاف ہوتی جاتی ہے۔ کاش کہ جیسی توجہ اور احتیاط وہ نظم میں کرتے ہیں ویسی ہی نثر میں بھی کرتے کیوں کہ ہم افسوس کے ساتھ دیکھتے ہیں کہ [مخزن کے] اسی پرچہ میں ان کے لکچر موسوم بہ 'قومی زندگی' میں بہت سی غلطیاں موجود ہیں۔" حسرت نے بعض غلطیوں کی نشان دہی بھی کی تھی۔

اقبال کی شاعری کے سلسلے میں یوپی و پنجاب کی ادبی محاذ آرائی کے ذکر کے ساتھ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ اس محاذ آرائی کے آغاز سے بہت پہلے اقبال نے یوپی کے ادبی حلقوں میں شہرت و مقبولیت حاصل کرلی تھی۔ یوپی کے قلب لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامہ "خدنگ نظر" کے جنوری ۱۹۰۲ء کے شمارے میں اقبال کی ایک نظم مندرجہ ذیل نوٹ کے ساتھ ملتی ہے:

"اس نمبر میں ہم 'شمع و پروانہ' کے عنوان سے مسٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج کی ایک نوتصنیف نظم شائع کرتے ہیں، جو پروفیسر صاحب نے ہمارے اصرار پر نہایت ہی عجلت میں تصنیف فرمائی ہے تاہم ان اشعار سے ان کی فن و زبان دانی کا پورا اندازہ ہوتا ہے، اور ہمارے شہر کے اہلِ زبان قیاس کر سکتے ہیں کہ پنجاب نے دنیائے شاعری میں کس حد تک ترقی کی ہے۔"

تین مہینے بعد اپریل ۱۹۰۲ء میں یہی نظم مخزن میں شائع ہوئی۔ 'خدنگ نظر' ہی کی اشاعت مئی ۱۹۰۲ء میں اڈیٹر کے توصیفی نوٹ کے ساتھ اقبال کی ایک اور نظم نیز ان کی شاعری اور "لائف" پر شیخ عبدالقادر کا سیر حاصل مضمون ملتا ہے جو رسالے کے دس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ نظم کے بارے میں اڈیٹر نے لکھا تھا:

"آفتاب سحر کی سُرخی سے مسٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کی تراوش دماغ کا ایک قیمتی اور فلسفیانہ نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس میں ممدوح نے زورِ طبیعت کے ساتھ اپنی عالمانہ استعداد اور شاعرانہ قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی لائف جو اس نظم کے بعد ہی

درج ہے، ہمارے بیان کی توضیح کرنے کو کافی ہے اور ان کا اصلی فوٹو جو رسالے کے ساتھ شائع کیا گیا ہے، زبانِ حال سے بتلائے گا کہ وہ کس فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کے خیالات کس عالم کی سیر کر رہے ہیں اور عنقائے مضامین شکار کرنے کی کون سی گھات ہے۔ ہندستان، خصوصاً پنجاب میں، وہ پہلے شاعر ہیں جو ہماری شاعری کے اُجلے دامن سے وہ دھبا عملی طور پر مٹا رہے ہیں جو ہماری کمیِ فکر اور سپاٹ خیالات کی بدولت پڑ گیا ہے۔ اور اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے کہ تخیّل ایمانِ شاعری ہے، تو مسٹر موصوف کے حکیمانہ خیالات قابلِ تقلید ہیں:

"کسبِ کمال کن کہ عزیزِ جہاں شوی
"کس بے کمال ہیچ نیرزد عزیز من"

آفتابِ سحر کے عنوان سے خدنگ نظر میں شائع ہونے والی پہلی نظم 'بانگِ درا' میں، اصلاح و ترمیم کے ساتھ، 'آفتابِ صبح' کے عنوان سے ملتی ہے۔ اڈیٹر نے اس نظم کے سلسلے میں اقبال کے شاعرانہ کمال کا جس لب و لہجے میں اعتراف کیا تھا، محتاجِ تشریح نہیں ہے۔ خدنگ نظر کا مئی ۱۹۰۲ء کا جو شمارہ راقم کو ملا، افسوس ہے کہ اس میں اقبال کا وہ 'اصلی فوٹو' نہیں تھا، جس کا اڈیٹر نے ذکر کیا ہے۔

اقبال کی لائف پر جو مضمون شاملِ اشاعت کیا گیا تھا، اڈیٹر نے اس پر ایک علاحدہ مندرجہ ذیل نوٹ لکھا تھا؛ جس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ یہ مخصوص 'خدنگ نظر' کے لیے لکھوایا گیا تھا:

"ذیل میں مسٹر محمد اقبال صاحب ایم، اے کی شاعرانہ لائف درج ہے جو ہمارے نامور ہم عصر شیخ عبدالقادر صاحب بی، اے اڈیٹر مخزن کے تراوشِ قلم کا نتیجہ ہے۔ مسٹر موصوف کی لائف لکھنے کے لیے شیخ صاحب سے زیادہ تمام

پنجاب میں دوسرا اہلِ قلم موزوں نہ تھا جو سخن سنجی میں پوری مہارت رکھتے ہیں ایم۔ ایم نے اپنے معزز ہم عصر کو بار بار مجبور کیا کہ وہ اپنے قابلِ فخر دوست کے وہ شاعرانہ حالات قلم بند فرمائیں جو وقتاً فوقتاً ان کی نکتہ سنج نظر سے گزرتے رہے ہیں۔ اس لائق کے متعلق ہمیں اتنا اور جتانا ہے کہ یہ پرانے اصول تذکرہ سے بالکل جداگانہ ہے، لیکن جدید فنِ سوانح نگاری کا کوئی پہلو فروگذاشت نہیں ہوا ہے۔ (ایڈیٹر)"

'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' بھی 'ترانۂ ہندی' ہی کی طرح مقبول ہوا۔ اس کا پہلا اور آخری بند یہ ہیں:

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

بندے کلیم جس کے، پربت جہاں کے سینا نوحِ نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینا
رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

اقبال کی قوم پرستی کا موثر ترین مظاہرہ 'نیا شوالہ' میں نظر آتا ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجکو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں بچھڑوں کو پھر ملا دیں، نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ　　　دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے　　　سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

"شاعری کے اعتبار سے یہ نظم" یوسف سلیم چشتی کے الفاظ میں" اقبال کے دورِ وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے ... شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لیے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے ۔ اکثر ناقدینِ اقبال کا خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر یہ اقبال کی بہترین نظم ہے ۔"۸۰

اقبال کے ابتدائی دور کی قوم پرستی کے واضح نشانات ان کی اولین تصنیف "علم الاقتصاد" میں بھی نظر آتے ہیں، جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا تھا :

"علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار سے بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں ... بالخصوص ہندستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے، کیوں کہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے ۔ ہمارا ملک کا اہل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح و بہبود کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے ۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان

کا حشر کیا ہوا ہے ... اگر اہلِ ہندستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کرکے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع رہے ہیں۔"

ستمبر ۱۹۰۵ء میں اقبال اعلا تعلیم کے لیے انگلستان گئے۔ اس سفر کے وقت اقبال کا جو قومی ذہن تھا، اس کا کچھ اندازہ ان کے ایک خط سے ہوتا ہے، جو وطن سے رخصت ہونے کے بعد اپنے دوست مولوی انشاء اللہ خاں، اڈیٹر 'وطن'، کو لکھا تھا، اور جو اسی زمانے میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ قیامِ بمبئی کے تجربات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"... اس ہوٹل میں ایک یونانی بھی آکر مقیم ہوا جو ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی بھی بولتا تھا۔ میں نے ایک روز اس سے پوچھا 'تم کہاں سے آئے ہو؟' بولا 'چین سے آیا ہوں، اب ٹرانسوال جاؤں گا۔ میں نے پوچھا چین میں تم کیا کام کرتے تھے؟ کہنے لگا سوداگری کرتا تھا لیکن چینی لوگ ہماری چیزیں نہیں خریدتے۔ میں نے سن کر دل میں کہا کہ ہم ہندیوں سے تو یہ افیمی ہی عقلمند نکلے کہ اپنے ملک کی صنعت کا خیال رکھتے ہیں۔ شاباش افیمیو! شاباش! نیند سے بیدار ہو جاؤ۔ ابھی تم آنکھیں ہی مل رہے ہو کہ اس سے دیگر قوموں کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ ہاں ہم ہندستانیوں سے یہ توقع نہ رکھو کہ ایشیا کی تجارتی عظمت کو از سرِ نو قائم کرنے میں تمہاری مدد کر سکیں گے۔ ہم متفق ہو کر کام کرنا نہیں جانتے۔ ہمارے ملک میں محبت اور مروت کی بُو باقی نہیں رہی۔ ہم اس کو پکا مسلمان

سمجھتے ہیں جو ہندوؤں کے خون کا پیاسا ہو اور اس کو پکا ہندو خیال کرتے ہیں جو مسلمان کی جان کا دشمن ہو۔ ہم کتاب کے کیڑے ہیں اور مغربی خیالات ہماری خوراک ہیں۔ کاش خلیج بنگالہ کی موجیں ہمیں غرق کر ڈالیں۔

"مولوی صاحب! میں بے اختیار ہوں، لکھنے تھے سفر کے حالات اور بیٹھ گیا ہوں وعظ کرنے۔ کیا کروں! اس سوال کے متعلق تاثرات کا ہجوم میرے دل میں اس قدر ہے کہ بسا اوقات [اس نے] مجھے مجنون سا کر دیا ہے، اور کر رہا ہے۔" [۱۱]

اسی خط میں اقبال نے ایک حجام کا بڑے فخر کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو سیاسی ذہن رکھتا تھا:

"اس شہر کی تعلیمی حالت عام طور پر نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے ہمارے ہوٹل کا حجام ہندستان کی تاریخ کے بڑے بڑے واقعات جانتا تھا۔ گجراتی اخبار ہر روز پڑھتا تھا اور جاپان اور روس کی لڑائی سے پورا باخبر تھا۔ نوروجی دادا بھائی کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ نوروجی انگلستان میں کیا کرتا ہے؟ بولا حجور [۱۲] کالوں کے لیے لڑتا ہے۔"

لندن پہنچنے کے بعد ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بحر روم کے ابتدائی حصے میں سمندر کا نظارہ نہایت دلچسپ تھا اور ہوا میں ایسا اثر تھا کہ غیر موزوں آدمی بھی موزوں ہو جائے۔ میری طبیعت قدرتاً شعر کی طرف مائل ہوئی اور میں نے چند اشعار کی غزل لکھی جو حاضر ہے۔"

اس غزل کا ایک شعر یہ ہے:

ہرے رہو وطنِ مازنی کے میدانو! جہاز پر سے تمہیں ہم سلام کرتے ہیں

'مازنی' کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مازنی، اٹلی کے محبّین کا سرگروہ تھا۔ یہ شعر اس وقت لکھا گیا تھا جب اس ملک کا ساحل نظر کے سامنے تھا"[۱۳]

اقبال نے اس شعر میں اٹلی کے عظیم محب وطن مازنی، کا جس لب و لہجے میں ذکر کیا ہے، اس سے خود ان کی حب الوطنی اجاگر ہو کر سامنے آتی ہے۔ خط میں یہ غزل پندرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ لیکن بانگ درا میں اس غزل کے صرف دس ہی شعر ملتے ہیں۔ پانچ حذف شدہ اشعار یہ ہیں:

عجب تماشا ہے مجھ کافرِ محبت کا صنم بھی سن کے جسے رام رام کرتے ہیں

ہوا جہاں کی ہے پرکار آفریں کیسی کہاں عدم کے مسافر قیام کرتے ہیں

نظارہ لالے کا تڑپا گیا مرے جی کو بہار میں اسے آتش بجام کرتے ہیں

رہینِ لذتِ ہستی نہ ہو کہ مثلِ شرار یہ راہ ایک نفس میں تمام کرتے ہیں

جہاں کو ہوتی ہے عبرت ہماری پستی سے

نظامِ دہر میں ہم کچھ تو کام کرتے ہیں

اس غزل کا آخری شعر کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ یہ تھا وہ قومی ذہن جو اقبال اپنے ساتھ انگلستان لے گئے تھے۔ قیام انگلستان کے ابتدائی دور تک اس نے ان کا ساتھ بھی دیا۔ رسالہ 'زمانہ' (کانپور) کی اشاعت مئی ۱۹۰۶ء میں "جناب پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ از کیمبرج" کا ایک مضمون "سودیشی کی تحریک" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون 'زمانہ' کے ایک استفسار کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

استفسار اور اس کے جواب کا پس منظر یہ تھا کہ ہندستان سے اقبال کی روانگی کے دو ماہ بعد برطانوی حکومت نے اپنے سیاسی مصالح کے پیشِ نظر بنگال کے صوبے کو "ہندو بنگال" اور "مسلم بنگال" میں تقسیم کیا تھا۔ اس اقدام کا بنگال ہی میں نہیں بلکہ پورے ملک میں شدید ردِ عمل ہوا، اور اس نے سودیشی کی ملک گیر تحریک کو جنم دیا۔ اس دَور کی مسلم قیادت، جو مسلمانوں کے بالائی طبقے کے ہاتھ میں تھی، چونکہ تقسیم بنگال کی حامی تھی، اس لیے قدرتی طور پر سودیشی کی تحریک کے بھی خلاف تھی۔ اسی کے پیشِ نظر رسالہ 'زمانہ' نے اوائل ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک کی بابت ایک مختصر سوالنامہ مرتب کر کے مسلمان اہلِ قلم مفکرین کے پاس بھیجا۔ ان میں ایک اقبال بھی تھے۔ انھوں نے انگلستان سے جو جواب بھیجا وہ 'زمانہ' کے مئی ۱۹۰۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے چند اقتباسات یہ ہیں:

"سودیشی کی تحریک ہندستان کے لیے کیا ہر ملک کے لیے جس کے اقتصادی و سیاسی حالات ہندستان کی طرح ہوں، مفید ہے۔ کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہو جائیں۔ ہمارے اہل الرائے سیاسی آزادی سیاسی آزادی پکارتے ہیں، مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی کی شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے ... جس کی طرف خوش قسمتی سے اب اہلِ وطن کو توجہ ہوئی ہے ...

"سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا ہے۔ اگر اتحادِ اغراض نہ ہوگا تو قومیت پیدا نہ ہوگی۔ اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ

نہ ہوں گے تو نظامِ قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعۂ افراد کی پروا نہیں کرتی۔ مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں مگر عملی زندگی اس قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ مذہب دنیا میں صلح کرانے کے لیے آیا ہے، نہ کہ جنگ کی غرض سے۔

"میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے۔ ایک صاحب نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں، کیوں کہ عام طور پر مسلمان زراعت پیشہ ہیں۔ ان کا یہ ارشاد شاید پنجاب کی صورتِ حال میں صحیح ہو گا، تاہم یہ کہنا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ مسلمانوں کو سودیشی کی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔

"اگر صبر و استقلال سے کام لیا گیا تو اس تحریک میں ضرور کامیابی ہو گی... ہمیں مقدس عہد لینا ہے کہ ہم خارجی ممالک کی مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے... اگر اس تحریک سے ہندو مسلمانوں میں اتحادِ اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔ ہندستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام جلی اقوام میں لکھا جائے۔ والسلام!"[14]

خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے اس دور کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:
"ملوکیت ہمیشہ اقوام کے تفرقے سے فائدہ اٹھا کر غلامی کا جوا ان کی

گردن پر رکھتی رہی ہے۔ انگریزوں کو اس ملک میں تفرقہ اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ یہاں ہزاروں برس سے انسانی گروہوں کے درمیان ناقابلِ عبور خلیجیں حائل رہی تھیں۔ ایسی حالت میں غیر ملکی حکومت اور استحصال کرنے والی ملوکیت سے نجات ہو تو کیوں کر ہو۔ آزادی طلب نوجوانوں کی سمجھ میں پہلے یہی بات آئی کہ ہم بھی انگریزوں کی طرح ایک قوم بن جائیں، اور تمام ملک کو اپنا وطن قرار دے کر اس کے متعلق جذبۂ وطنیت کو ابھاریں۔ مذہبی اختلافات کو غیر اصلی قرار دیا جائے اور وطن کی عظمت کے گیت گائے جائیں تاکہ غیر ملکی حکومت نے جو احساسِ کمتری پیدا کر دیا ہے اس کے خلاف ایک زبردست ردِعمل ہو۔ پرانے دیوتاؤں کی پوجا کو باطل قرار دے کر بڑے بُت کی پوجا کی جائے۔ اسی خیال اور جذبے کے تحت نوجوان اقبال کا حساس قلب وطن کے ترانے گانے لگا... اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کی خدمت کے لیے وقف کیا تو مسلمانوں کے علاوہ، بلکہ ان سے زیادہ، ہندو ان سے متاثر ہوئے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

"ملک کے طول و عرض میں گونجنے لگا۔ بعض ہندو مدارس میں بھی مدرسہ شروع ہونے سے قبل طالب علم اس کو کورس میں گاتے تھے... ہندوستان میں وطنیت کے جذبے کو جس شاعر نے سب سے پہلے گرمایا، وہ اقبال باکمال تھا۔ ہندوستان اگر ایک وطن اور ایک قوم بن سکتا تو اقبال کا وطنیت کا کلام اس کے لیے الہامی صحیفہ ہوتا۔"[15]

یہی بات وقار عظیم نے اپنے انداز میں کہی ہے:

"اقبال کی شاعری کا ایک نمایاں جذبہ وطن کی محبت ہے۔ 'ہمالہ' کے علاوہ 'ترانۂ ہندی' اور 'ہندستانی بچوں کا قومی گیت' میں اس جذبے کی بہت واضح اور صریح ترجمانی موجود ہے۔ 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' اور 'چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا' میں وطن کی محبت کے جس پاک اور بے لوث جذبے کی مصوری ہے، اسی کا اثر ہے کہ یہ دونوں نظمیں (خاص کر پہلی نظم) ایک زمانے تک ہندستان کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ اور نظموں میں قبولِ عام کی اس سے بہتر مثال اردو نظم کی پوری تاریخ میں موجود نہیں۔"[۱۱]

حوالے

۱۔ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال: محمد دین فوق: نیرنگ خیال (لاہور) اقبال نمبر ۱۹۳۲ء ص ۳۲

۲۔ جوہر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے طالب علموں کا رسالہ) اقبال نمبر ۳۸۔

۳۔ MAHATMA: G.D. Tendulkar, Vol. VIII, p.296

۴۔ Ibid p.109

۵۔ علامہ اقبال کے ترانہ کی شانِ نزول: سید ظفر ہاشمی: ہفت روزہ چٹان (لاہور) یکم مئی ۱۹۶۷ء بہ حوالہ اوراقِ گم گشتہ، رحیم بخش شاہین۔ ص ۳۱۸

۶۔ DICTIONARY OF NATIONAL BIOGRAPHY

۷۔ بہ حوالہ اوراقِ گم گشتہ: ص ۱۲۔ ۱۱۴

۸۔ شرح بانگ درا: یوسف سلیم چشتی: ص ۲۱۹

۹۔ علم الاقتصاد: شیخ محمد اقبال: ص ۲۔ ۳۱

۱۰۔ بیس پچیس سال بعد بھی یہ واقعہ اقبال کے ذہن میں رہا ہوگا جب اُنھوں نے یہ شعر کہا تھا:

ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے ؎ گراں خواب چینی سنبھلنے لگے

۱۱۔ خطوطِ اقبال: رفیع الدین ہاشمی: ص ۱-۸۰

۱۲۔ ایضاً: ص ۸۵

۱۳۔ ایضاً: ص ۲-۱۰۰

۱۴۔ انوارِ اقبال: مرتبہ بشیر احمد ڈار: بہ حوالہ سفرنامہ اقبال: مرتبہ حق نواز ص۔ ۵۲-۴۹

۱۵۔ فکرِ اقبال: خلیفہ عبدالحکیم: ص ۸-۳۷

۱۶۔ اقبال شاعر اور فلسفی: سید وقار عظیم: ص ۲۱

رہنے دو خم کے منہ پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

ستمبر ۱۹۰۵ء سے جولائی ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ اقبال نے یورپ میں بسر کیا۔ اس مدّت کا بیشتر حصہ انگلستان میں اور کم تر حصہ انھوں نے جرمنی میں گزارا۔ یورپ کے اسی تین سالہ قیام کے دوران میں ان کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا، اور وہیں ختم بھی ہو گیا۔ اس دَور میں اقبال نے یا تو شاعری کی طرف کم توجہ دی، یا پھر جتنا کچھ انھوں نے کہا اس کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچ سکا ہے۔ ان کے اس دور کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ ان کی شاعری پر بڑی حد تک رومانیت چھائی رہی۔ 'بانگِ درا' میں اقبال نے اس دَور کا آغاز جس نظم سے کیا ہے، اس کا عنوان 'محبت' ہے۔ اس کے چند اشعار ہیں، جن میں محبت کے اجزائے ترکیبی بیان کیے گئے ہیں:

چمک تارے سے مانگی، چاند سے داغِ جگر مانگا
اُڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

تڑپ بجلی سے پائی، حور سے پاکیزگی پائی
حرارت لی نفسہائے مسیحِ ابنِ مریم سے

ذرا سی پھر ربوبیت سے شانِ بے نیازی لی
فلک سے عاجزی، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں
مرکّب نے محبت نام پایا عرشِ اعظم سے

یہی رنگ اقبال کے دوسرے دَور کی شاعری پر چھایا رہا۔ بانگِ درا کے حصہ دوم (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۸ء) میں چوبیس نظمیں ملتی ہیں۔ ان میں سے تین نظموں: 'طلبائے علی گڑھ کے نام' 'عبدالقادر کے نام' اور 'صقلیہ' کے علاوہ کسی بھی نظم میں قومی یا سیاسی جذبات کی پُٹ بھی نہیں ملتی۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس دَور کی متذکرہ سیاسی نظموں کا رنگ ان کی سابقہ

قومی نظموں سے مختلف تھا۔

اقبال کے شعری مزاج کی تبدیلی کے حقیقی اسباب بڑی حد تک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ ان کے قیامِ یورپ کے لیے عینی شاہد دو ہی ہیں جن سے ان کے اس دور کی زندگی کے کچھ حالات ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ ایک شیخ عبدالقادر دوسرے عطیہ فیضی۔ شیخ عبدالقادر کا بیان ہے کہ اقبال کے قیام انگلستان کے تین سالوں میں دو سال ایسے تھے جن میں میرا بھی وہیں قیام تھا، اور اکثر ملاقاتوں کے موقع ملتے رہے تھے۔" تاہم بانگِ درا کے دیباچے میں اقبال کے قیام انگلستان کا اجمالی ذکر کرنے کے علاوہ اُنھوں نے شاید اور کسی جگہ اس موضوع پر تفصیلی روشنی نہیں ڈالی ہے۔

عطیہ بیگم اور اقبال کا لندن اور جرمنی میں اگرچہ چھ ماہ سے زیادہ ساتھ نہیں رہا، تاہم اقبال کی وفات کے بعد عطیہ بیگم نے 'اقبال' ہی کے عنوان سے ایک مختصر سی کتاب انگریزی میں لکھی جو فروری ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں اقبال کے قیامِ یورپ کا حصّہ اُنھوں نے اپنی ذاتی ڈائری سے اخذ کر کے درج کیا ہے۔ اقبال نے وقتاً فوقتاً جو خطوط عطیہ کو لکھے تھے اور جو نظمیں ان کو بھیجی تھیں، ان کے عکس بھی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں۔ خطوط گنتی میں دس ہیں، لیکن ان میں سے ایک ہی قیامِ یورپ کے دوران کا ہے۔ متعدد تصاویر بھی ہیں۔ جن میں سے ایک عطیہ اور اقبال کے قیام ہائیڈل برگ کی یادگار ہے۔ یہی تصویر اقبال کے فارسی کلیات (مطبوعہ تہران) میں بھی شامل کی گئی ہے۔ جس کے نیچے مندرجہ ذیل دلچسپ اور معنی خیز عبارت ملتی ہے، جو اقبال سے زیادہ خود عطیہ کی شخصیت پر روشنی ڈالتی ہے:

"اقبال و عطیہ در ہیدربرگ، ۱۹۰۷ میلادی۔ عطیہ بیگم از نوادر بانوے پاکستان بود کہ مورد توجہ سہ تن از بزرگ ترین شخصیت ہائے شبہ قارہ ہند و پاکستان، یعنی شبلی نعمانی، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا اقبال لاہوری

قرار گرفت۔؂[1]

یہ بیان بڑی حد تک حقائق پر مبنی ہے۔ ابوالکلام آزاد کا تو اب تک ایک ہی خط مل سکا ہے جو عطیہ کے اس خط کے جواب میں لکھا گیا تھا، جس میں انھیں قیدِ فرنگ سے رہائی (۱۹۲۳ء) کی مبارک باد دی گئی تھی۔ لیکن خطوطِ شبلی نے تو عطیہ بیگم کو شہرتِ دوام عطا کی۔ یہ اتفاق ہے کہ اقبال کے خطوط کو وہ شہرت حاصل نہ ہو سکی جو شبلی کے خطوط کے حصے میں آئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی تھی کہ یہ سارے خطوط انگریزی میں لکھے گئے تھے، دوسری اور شاید بڑی وجہ یہ تھی کہ اقبال کے خطوط کو نہ تو کوئی امین زبیری نصیب ہوا، نہ کوئی وحید قریشی ملا، نہ کوئی شیخ محمد اکرام۔

اقبال اور شبلی کم و بیش ایک ہی زمانے میں عطیہ کے دامِ الفت میں گرفتار ہوئے۔ شیخ اکرام کا بیان ہے کہ "ستمبر ۱۹۰۶ء میں تو شبلی کو ماہِ تمام [عطیہ] کی فقط ایک آدھ جھلک نظر آئی تھی، لیکن ۱۹۰۷ء کے اواخر اور ۱۹۰۸ء کے شروع میں انھیں موقع ملا کہ وہ آرام و اطمینان سے اس کی ضیا باری سے حظ اٹھائیں۔"[2] یہ بیان اگر صحیح ہے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شبلی سے سات آٹھ ماہ قبل اپریل تا ستمبر ۱۹۰۷ء اقبال پر یہ فصلِ بہار گزر چکی تھی۔

اقبال اور شبلی دونوں کے خطوط کے سرسری مطالعے سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ دونوں عطیہ سے بیحد مرعوب ہوئے تھے۔ اس مرعوبیت کی بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ ان دونوں کو زندگی میں پہلی بار ایک ایسی نوجوان مسلمان خاتون سے سابقہ پڑا تھا جو شریف اور با وجاہت خاندان کی چشم و چراغ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلا تعلیم یافتہ، انتہائی ذہین، حاضر جواب، تیز و طرار و بے حجاب تھی۔

اقبال اور شبلی ہی پر منحصر نہیں ہے، جو بھی عطیہ سے ملتا، وہ متاثر ضرور ہوتا۔ ۱۹۰۸ء کے اوائل میں عطیہ نے اپنی بڑی بہن ہر ہائی نس نازلی رفیعہ سلطان اور ان کے

شوہر ہز ہائی نس نواب جنجیرہ کی معیت میں یورپ کا دوسرا سفر کیا تو جہاز پر جو لوگ ان کے ہم سفر تھے ان میں رمیش چندر دت بھی تھے۔ نازلی بیگم کے سفرنامہ کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ:

"مسٹر دت سے اور عطیہ سے آج یورپ کے مشاہدات پر گفتگو ہوئی۔ مسٹر دت نے اس کے مشاہدات کی درستی، اس کی معلومات اور انگریزی زبان کی مہارت کی بہت تعریف کی۔"[۳]

یہ رمیش چندر دت (۱۸۴۸ تا ۱۹۰۹ء) ریٹائرڈ سول سرونٹ (I.C.S) ممتاز مصنف عالم، مورخ اور لندن یونیورسٹی میں تاریخ کے استاد تھے۔

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ شبلی اور اقبال نے عطیہ کا التفات حاصل کرنے کے لیے متضاد راستے اختیار کیے۔ شبلی عطیہ سے عمر میں تیس بتیس سال بڑے تھے، اس لیے انھوں نے شفیق معلم کا روپ دھارا۔[۴] عمر کے تفاوت ہی کا شاید یہ نتیجہ تھا کہ عطیہ شبلی سے بے تکلف نہیں ہو سکیں اور شبلی بھی دل باختگی کے باوجود عطیہ سے کھل نہیں سکے۔ اقبال اور عطیہ کی عمر میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال کا بل تھا۔ اسی لیے ان دونوں کے تعلقات بڑی حد تک برابری کے سے تھے۔ اقبال نے پہلی ملاقات کے بعد عطیہ کو معلم بنا لیا۔[۵] انھیں اپنا پورا مقالہ پڑھ کر سنایا اور ان کی رائے معلوم کرنا اور اس کے مطابق ترمیم و اضافہ کرنا چاہا۔

خطوطِ شبلی پر اقبال کو اس اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ اول الذکر کتاب میں صرف شبلی ہی کے خطوط ملتے ہیں اور خود عطیہ کے ردِ عمل کا ہمیں براہ راست علم نہیں ہوتا۔ لیکن موخر الذکر میں عطیہ نے خود اپنے تاثرات بھی شامل کر کے یہ تشنگی بڑی حد تک کم کر دی ہے۔ مگر جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے عطیہ کی کتاب بھی انتہائی تشنہ ہے۔ پوری کتاب میں ایک ہی اندراج ایسا ملتا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ قومی

شاعر کی حیثیت سے اقبال کو ہندستان میں جو مقبولیت حاصل تھی، اس میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس کی صدائے بازگشت انگلستان میں بھی گونج رہی تھی۔ عطیہ کا بیان ہے کہ:

"۲۷ جولائی ۱۹۰۷ء کو احباب کی ایک بزم بے تکلف منعقد ہوئی جس میں بیش تر ہندستانی مقیم لندن شریک ہوئے۔ ایک نوجوان ہندستانی پرمیشور لال نے بڑے پُرجوش انداز میں وہ خطوط پڑھ کر سنائے جو اس کے گھر والوں نے لکھے تھے۔ پھر اُسی نے 'مخزن' نامی ایک رسالہ سے چند نظمیں بھی پڑھ کر سنائیں اور حاضرین کو محظوظ کیا۔ یہ سب اقبال کی وطنی نظمیں تھیں۔ اس نے کہا کہ یہ نظمیں سارے شمالی ہند میں گائی جاتی ہیں اور گھروں، بازاروں اور گلیوں کی فضائیں اقبال کی ان نظموں سے گونج رہی ہیں، اور ان کی وجہ سے ہندستان میں قومیت کا وہ احساس پیدا ہو رہا ہے، جو اس سے پہلے مفقود تھا۔ یہ سُن کر سارے مجمع میں اس قدر جوش و خروش پیدا ہوا کہ سارے مجمع نے مخزن میں چھپی ہوئی نظموں کو گانا شروع کر دیا اور سارا ہال اقبال کے نغموں سے گونجنے لگا۔"[6]

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال کی جن نظموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ بانگِ درا کے پہلے حصے میں ملتی ہیں۔ قیامِ انگلستان کے دوران میں اقبال نے کوئی ایسی نظم نہیں کہی جو ان کے سابقہ رنگ کی آئینہ دار ہو۔ البتہ اس دور میں اُنھوں نے دو ایسی نظمیں ضرور کہیں جو ان کی فکر میں رونما ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا عنوان ہے 'طلبۂ علی گڑھ کے نام'، اس کا محرک علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کے ایک گروہ کا یہ مطالبہ تھا کہ کالج کے یورپین اسٹاف اور یورپین پرنسپل کو خارج کر دیا جائے۔ اس نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

اوروں کا ہے پیام اور، میرا پیام اور ہے
عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم
یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز
غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی، شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے منہ پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

آخری شعر کی شرح یوسف سلیم چشتی نے یوں بیان کی ہے:

"اے نوجوانو!...... ابھی تمہارے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے مصلحتاً تم ابھی کچھ عرصے کے لیے اپنے کالج کا نظم و نسق انگریز پرنسپل (انگریزی حکومت) ہی کے ہاتھ میں رکھو۔"

اور اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے اقبال کے ذہن کی ایک اہم گرہ کھلتی ہے:

"یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۷ء میں لکھی تھی۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے اور انھیں وہ پیغام دیا ہے جو اُن کی شاعری اور ان کے فلسفے کی ساری کائنات ہے ...... ۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندستان میں علی العموم اور بنگال میں علی الخصوص سیاسی شورش کا زمانہ تھا۔ چونکہ مسلمانانِ ہند کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا، اس لیے اقبال نے قوم کے نوجوانوں کو عشق اور عمل کا پیغام دیا۔ اس نظم میں ان تصورات کا ابتدائی نقش نظر آتا ہے، جنھوں نے آگے چل کر ایک منظم فلسفۂ زندگی کی شکل اختیار کر لی۔ اس نظم میں وہ چنگاریاں

پوشیدہ ہیں جو کچھ عرصہ بعد شعلہ بن گئیں۔"۸

مندرجہ بالا اقتباس میں جس "سیاسی شورش" کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ تقسیم بنگالہ کی پیدا کردہ تھی۔ تقسیم بنگالہ ہی کے جلو میں سودیشی کی تحریک نے اور دہشت پسندی نے جنم لیا، مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا، جو بیسویں صدی کے نصف اول میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مسلسل نزاع کا سبب بنا رہا۔

عبدالقادر کے نام کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی تھی، اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے ایک نئے عزم کا اظہار ہوتا ہے اور ہمیں اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے اپنی مستقبل کی شاعری کی ایک نئی راہ متعین کر لی تھی:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور سے — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق — سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اٹھا لیں اپنا — سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار — قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ — چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جییں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں [illegible] اغیار کو بینا کر دیں

بانگ درا کے حصۂ دوم کی ایک غزل کے مخاطب بھی شیخ عبدالقادر ہی ہیں اور وہ بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے:

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے — اسے ہے سودائے بخیہ کاری، مجھے سرِ پیرہن نہیں ہے
نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ — نمود ہر شے [illegible] ہماری، کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں اُنھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اس غزل کے مقطع کو سمجھنے کے لیے ہمیں "مدیرِ مخزن" شیخ عبدالقادر ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا، جو لندن میں اقبال کے ساتھ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:

"ایک دن شیخ محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں، اور قسم کھالیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے اسے کسی اور مفید کام میں صرف کریں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی نہیں ہے جسے ترک کرنا چاہیے بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی مفید خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے اور کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے... میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری چھوڑنا جائز نہیں اور جو وقت وہ اس شغل کی نذر کرتے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔"

یہی "آرنلڈ صاحب" جو آگے چل کر سر تھامس آرنلڈ بنے، اقبال کے شفیق اُستاد اور دوست تھے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ہندستان ہی میں بسر کیا تھا۔ پہلے طویل مدت تک ام، اے، او، کالج علی گڑھ سے وابستہ رہے، وہیں شبلی نعمانی سے ان کی ملاقات اور دوستی ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ آرنلڈ ہی نے شبلی کو جدید مغربی

افکار سے روشناس کرایا۔ علی گڑھ سے آرنلڈ لاہور چلے گئے اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ علوم السنۂ شرقیہ کے پروفیسر کی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہیں اقبال کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ آرنلڈ کے ساتھ اقبال کے قلبی لگاؤ کا اندازہ ان کی نظم "نالۂ فراق" سے ہوتا ہے، جو آرنلڈ کے انگلستان واپس جانے کے بعد، ان ہی کے فراق میں لکھی گئی تھی۔ اسی نظم میں اقبال نے اس عزم کا بھی اظہار کیا تھا:

کھول دے گا دشتِ وحشت عقدۂ تقدیر کو　　توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

آرنلڈ کو اسلام اور تبلیغ اسلام سے بھی شغف تھا۔ اقبال نے طالب علمی ہی کے زمانے میں لندن سے ایک خط میں حسن نظامی کو لکھا تھا:

"مسٹر آرنلڈ کا یہ خیال ہے کہ ہندستانی مسلمانوں نے ہندوؤں میں اسلام پھیلانے کے لیے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی، اور اب وہ وقت ہے کہ ایسا کیا جائے۔۔۔!"

گمان غالب ہے کہ جارحانہ وطن پرستی سے اسلام کی طرف اقبال کی شاعری کا رخ موڑنے میں آرنلڈ کی کوششوں کا بھی خاصا ہاتھ رہا ہوگا۔ اس سلسلے میں براؤن اور نکلسن جیسے مستشرقین کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں، جو کیمبرج ہی میں استاد تھے اور جن سے اقبال نے کسبِ فیض کیا تھا۔ نکلسن نے تو آگے چل کر مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ کر کے یورپ کو اقبال سے روشناس کرنے کی پہلی کوشش کی، اسی طرح اقبال کے سیاسی ذہن کی تربیت میں نکلسن اور براؤن کے علاوہ سر سید امیر علی کو بھی بڑا دخل رہا ہوگا، جنھوں نے کلکتہ کی سکونت ترک کر کے لندن میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس کی تائید اس خیال سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۹۰۸ء میں برطانوی رائے عامہ کو مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے روشناس کرنے اور جداگانہ نیابت کے لیے برطانوی رائے عامہ کو ہموار کرنے کی غرض سے جب لندن میں مسلم لیگ کی برٹش کیٹی کا قیام عمل

میں آیا تو سید امیر علی کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر محمد اقبال بار ایٹ لا مجلس عاملہ کے ممبر چنے گئے۔ قواعد وضوابط وضع کرنے کے لیے ایک سب کمیٹی مقرر ہوئی جس میں سید امیر علی کے ساتھ میجر حسن بلگرامی اور ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل کیے گئے۔"

آرنلڈ کی اسلام دوستی کے متعلق ابتدا میں اقبال کی جو رائے تھی، وہ آگے چل کر یکسر بدل گئی تھی۔ نذیر نیازی کا بیان ہے کہ آرنلڈ کے انتقال کی خبر سن کر اقبال کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور پھر سر جھکا کر چند لمحے خوب روئے۔ اور کہا کہ "اقبال اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا۔" لیکن جب نذیر نیازی نے آرنلڈ کی اسلام نوازی کا ذکر کیا، تو اقبال نے کہا:

"اسلام؟ اسلام سے آرنلڈ کا کیا تعلق؟ آرنلڈ کی وفاداری صرف خاکِ انگلستان سے تھی۔ وہی ان کا دین تھا، اور وہی ان کی دنیا۔ انھوں نے جو کچھ کیا انگلستان کے مفاد کے لیے کیا ... آرنلڈ کو مسیحیت سے غرض تھی، نہ اسلام سے۔ بلکہ سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو آرنلڈ کیا ہر مستشرق کا علم وفضل بھی وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو مغرب کی ہوس استعمار اور شہنشاہیت کے مطابق ہو۔ ان حضرات کو بھی شہنشاہیت پسندوں اور سیاست کاروں کا دست وبازو تصور کرنا چاہیے ..."[۱۴]

'بانگ درا' کے حصہ دوم (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کی آخری نظم 'صقلیہ' ہے اور یورپ سے لوٹتے ہوئے اس وقت کہی گئی تھی، جب جہاز جزیرہ سسلی کے سامنے سے گزر رہا تھا اس طویل نظم کے چند اشعار یہ ہیں:

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار!

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

اسی نظم کا ایک بند یہ ہے:

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

عبدالمجید سالک کا یہ بیان صحیح ہے کہ اس دور کی نظموں میں 'علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام'، اور 'عبدالقادر کے نام' سے جو نظمیں لکھی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اب 'ہمالہ'، 'نیا شوالہ'، 'گایتری'، 'میرا وطن وہی ہے' کا دور گزر چکا تھا۔ ملکی ترانے کی لے غائب ہو چکی تھی اور اقبال اپنے لیے ایک نیا راستہ تجویز کر چکا تھا[۱۳]"۔ بہ قول خلیفہ عبدالحکیم "قیام انگلستان کے دوران ہی میں اقبال کا زاویۂ نگاہ وطنیت سے ملت کی طرف پھر گیا... شیخ عبدالقادر کے نام دعوتِ شعلہ نوائی بھی اسی زمانے کے احساس کی پیداوار ہے[۱۴]"۔

مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی تائید ایک طویل غزل سے بھی ہوتی ہے، جو بانگ درا کے حصہ دوم کی آخری غزل ہے اور سترہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اسے اگرچہ غزلیات کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے، لیکن یہ حقیقتاً نظم ہی ہے اور ان ولولہ انگیز انقلابی حالات سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی جو ترکی و ایران میں رونما ہو رہے تھے۔ اسے ان کے اس تیسرے دور کی شاعری کا دیباچہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا جو کم و بیش ان کی پوری شاعری پر محیط تھا۔ اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں:

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا
کبھی جو آوارۂ جنوں تھے وہ بستیوں میں پھر آبسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا
میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

حوالے

۱۔ کلیات اشعار فارسی مولانا اقبال لاہوری: مرتبہ احمد سروش: تصویر مقابل ص ۴۸

۲۔ شبلی نامہ: شیخ محمد اکرام: ص ۱۵۳

۳۔ سیر یورپ: نازلی بیگم: ص ۶

۴۔ دیکھیے خطوط شبلی خط نمبر ۲، ۳، ۴، ۶

۵۔ IQBAL: Atia Begum, p.18

۶۔ Ibid p.19

۷۔ شرح بانگ درا: یوسف سلیم چشتی: ص ۱۹۴

۸۔ ایضاً: ص ۱۹۵

۹۔ بانگِ درا (دیباچہ) ص ل، م

۱۰۔ اقبال نامہ: دوم: مرتبہ شیخ عطاء اللہ: ص ۳۵۷

۱۱ ذکر اقبال: عبدالمجید سالک ص ۵۷

۱۲ مکتوبات اقبال: مرتبہ نذیر نیازی: ص ۷-۹۹

۱۳۔ ذکر اقبال: ص: ۵۹

۱۴۔ فکر اقبال: خلیفہ عبدالحکیم ص ۸۲

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

۱۹۰۸ء میں اقبال وطن لوٹے تو ملک کا سیاسی مطلع حد درجہ بوجھل ہو رہا تھا۔ تقسیم بنگالہ کے ردِ عمل نے سودیشی کی ملک گیر تحریک کو اور اس سے بھی بڑھ کر دہشت انگیزی کے رجحانات کو جنم دیا تھا۔ ملک کے اور حصوں کی طرح پنجاب کی سرزمین بھی ان تحریکوں کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی تھی۔ ۱۹۰۹ء میں بنگال کی دہشت پسند تحریک کے اثرات پنجاب میں بھی رونما ہوئے تھے اور باغیانہ لٹریچر کی وسیع پیمانے پر اشاعت ہو رہی تھی۔ حکومت نے اس لٹریری سازش کی روک تھام کے لیے شدید اقدامات کیے بعض گھروں کی تلاشی لی گئی تو باغیانہ لٹریچر کے ساتھ بم بنانے کے نسخوں کی کتاب بھی برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی صوبائی شاخ بھی پنجاب میں قائم ہو چکی تھی۔ اس کے صدر جسٹس شاہ دین، سکریٹری میاں محمد شفیع، جوائنٹ سکریٹری میاں فضل حسین اور اسسٹنٹ سکریٹری مرزا جلال الدین بیرسٹر تھے۔ اقبال نے قیام انگلستان کے آخری ایام میں مسلم لیگ کی برطانوی کمیٹی سے جو عملی تعلق پیدا کیا تھا، اُس کے پیش نظر وطن لوٹتے ہی پنجاب صوبائی مُسلم لیگ سے ان کا وابستہ ہو جانا قدرتی تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے وجود میں آنے سے قبل لاہور میں مسلمانوں کی دو سیاسی انجمنیں تھیں، ایک کا نام 'مسلم لیگ' تھا جس کے روحِ رواں میاں فضل حسین تھے اور ایک مسلم اسوسی ایشن تھی جس کے سربراہ میاں محمد شفیع تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے وجود میں آنے کے بعد ان دونوں انجمنوں نے کوشش کی کہ ان کا الحاق آل انڈیا مسلم لیگ

سے ہو جائے اور اس دوڑ میں میاں محمد شفیع کامیاب ہو گئے، اور ان کی مسلم اسوسی ایشن پنجاب صوبائی مسلم لیگ میں تبدیل ہو گئی ۔ میاں فضل حسین نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ کی جوائنٹ سکریٹری شپ تو قبول کر لی، لیکن اس میں عملاً کوئی سرگرم حصّہ نہیں لیا۔ [2]

عظیم حسین کا بیان ہے کہ ان کے والد " فضل حسین نے اور ان کے ترقی پسند مسلمان دوستوں نے ۔ پیر تاج الدین، ملک برکت علی، ڈاکٹر محمد اقبال، خلیفہ شجاع الدین چودھری شہاب الدین اور غلام بھیک نیرنگ وغیرہ نے ۔ نوزائیدہ مسلم لیگ میں کوئی سرگرم حصّہ نہیں لیا۔ [3]" یہ بیان اقبال کی حد تک صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ وہ "نومبر ۱۹۱۰ء میں پراونشل مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری مقرر ہوئے" اور "یکم اپریل ۱۹۱۱ء کی شام کو یونیورسٹی ہال لاہور میں ہز اکسیلنسی وائسرائے کی خدمت میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی جانب سے اڑتالیس اصحاب پر مشتمل ایک وفد پیش ہوا اور مندرجہ ذیل سپاسنامہ پیش کیا۔ اس وفد میں علامہ اقبال بھی شریک تھے۔" اس سپاسنامے پر دستخط کرنے والے اڑتالیس افراد میں فضل حسین اور ان کے ترقی پسند مسلمان دوستوں کے نام، علاوہ اقبال کے، نہیں ملتے ۔ اس سپاسنامہ کے اقتباسات کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔

" بگرامی خدمت ہز اکسیلنسی دی رائٹ آنرایبل چارلس بیرن ہارڈنگ آف پنشرسٹ ... وائسرائے و گورنر جنرل ہندستان ۔

حضور عالی! ہم پراونشل مسلم لیگ پنجاب اور اس کی ۱۹ ڈسٹرکٹ برانچوں کے عہدہ داران اس کی اجازت چاہتے ہیں کہ صوبہ ہذا کی اسلامی آبادی کی طرف سے یور اکسیلنسی کے اول مرتبہ دارالامارۃ پنجاب میں تشریف لانے پر آپ کا نہایت مؤدبانہ وعقیدت مندانہ خیر مقدم کریں اول وائسکونٹ ہارڈنگ آف لاہور، فاتح مدکی و فیروز شہر کے پوتے

کے لیے پانچ دریاؤں کی سرزمین میں آنا ایسی باتوں سے لبریز ہونا چاہیے جن کی یاد کرنے سے بہت بڑی مسرت کا احساس پیدا ہونا لازمی ہے۔ ۱۸۴۹ء کا مشہور عہد نامہ، جس کے کوئی تین سال بعد اس سارے صوبے کا الحاق کیا گیا، پنجاب کی تاریخ میں ایک بہتری کی سمت موڑنے والا پہلا موقع تھا… اس شائستہ گورنمنٹ کی شکر گزاری کا، جس کے تحت ہم امن و خوش حالی کی برکات اٹھا رہے ہیں، جو بارِ عظیم ہم پر ہے وہ کبھی ماسوائے ازیں پورے طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا کہ ہم اس کی پائیداری و استقلال کی تائید میں ہر قربانی اپنی طرف سے اٹھانے کے لیے خلوص کے ساتھ تیار رہیں۔

"ہم اس موقع سے یہ فائدہ اٹھانے کی جرأت کرتے ہیں کہ یور ایکسیلنسی کو جو ہندستان میں ہمارے نہایت مہربان فرمانروا کے نائب ہیں اسلامی جماعت کی تاجِ برطانیہ کے ساتھ غیر متبدل وفاداری و جاں نثاری کا یقین دلائیں۔ ہم درحقیقت ایسی شاندار سلطنت کی شہریت پر متفخر ہیں … پنجاب کے اہلِ اسلام نے ہمیشہ اس کو اپنا ایک مقدس فرض سمجھا ہے کہ حکام کو امن و انتظام برقرار رکھنے میں پوری مدد دیں اور انھوں نے بار بار، نہ صرف الفاظ بلکہ افعال و اعمال کے ذریعے سے برٹش مقصد کے ساتھ اپنی تمام تر دلی عقیدت کا کافی ثبوت دیا ہے۔ جب گذشتہ چند سال میں ہندستان کا پولیٹکل مطلع اس صوبے میں بھی سیڈیشن اور بے چینی کے بادلوں سے مکدر ہو رہا تھا، مسلمانوں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اپنی برٹش گورنمنٹ کی مستحکم عقیدت میں پس و پیش نہیں کیا۔

"ہز مجسٹی کی رعایا کے دوسرے فرقوں کے ساتھ مسلمان بھی گورنمنٹ کے نہ دِل سے ان اعلا پولیٹیکل مراعات کے واسطے جو کہ عظیم الشان اصلاحی اسکیم (مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات) کے متعلق، (جو حال میں اس ملک میں جاری کی گئی ہے) ہندستانی رعایا کو عطا کی گئی ہیں، مشکور ہیں۔ یور اکسیلنسی کے شریف دل پیش رَو نے مسلمانوں کے ضروری مقاصد کی نگہداشت کے لیے مسلمانانِ ہندستان کو علاحدہ قائم مقامی (جداگانہ نیابت) کے وہ قیمتی حقوق امپیریل اور پراونشل کونسلوں میں عطا فرمائے۔ اور ہم یہ دیکھ کر نہایت خوش ہوتے ہیں کہ یور اکسیلنسی کی گورنمنٹ نے حال ہی میں ایک موقع پر اس عہد کی تجدید کی ہے، جو کہ اس وقت انہیں عطا کیا گیا تھا۔

"ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ اس فیاضانہ اظہار نے (عہد کی تجدید نے) تمام مسلمانان کی بے اندازہ شکر گذاری یور اکسیلنسی کی گورنمنٹ کے لیے حاصل کرلی ہے اور مسلسل انگریزی حکمت عملی اور برٹش کے ناقابلِ شکست وعدوں کی نمایاں اور مستحکم ثبوت بہم پہنچا دیا ہے جو کہ اس چٹان کو بناتے ہیں جس پر حکومتِ برطانیہ کے شاندار ایوان کی بنیاد قائم ہے۔

" ہم ایک بار پھر اپنی دلی نفرت کا اظہار ان انارکسٹوں کی کارروائیوں پر کرتے ہیں جنھوں نے کہ گذشتہ سالوں میں اہلِ ہند کی بے عیب نیک نامی پر ایک بدصورت داغ لگا دیا ہے اور بہ نظر انارکسٹانہ جرائم کے پھر پھوٹ پڑنے کے جیسا کہ کلکتہ میں حال کے جرائم سے ظاہر ہوا ہے ہم اپنا قومی فرض سمجھتے ہیں کہ اس شرمناک تحریک پر اپنی زوردار ناراضگی

کا اظہار کریں، جس کا نتیجہ یہ خوفناک جرائم ہیں ...۵

اس تاریخی دستاویز کا طویل اقتباس اس لیے پیش کیا گیا ہو کہ، اس دور کے اسلامی ہند کے عام انداز فکر کی یہ عکاسی کرتا ہے، جس سے اقبال بھی مستثنا نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس دور کے بیشتر ہندوؤں کا انداز فکر بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ عین ممکن ہے کہ پنجاب کے ہندو داروں نے بھی اسی سے ملتے جلتے سپاس نامے پیش کیے ہوں۔

اس سپاسنامے کا یہ پہلو خصوصیت سے قابلِ غور ہے کہ اس میں حکومت کی جن عنایات کا شکریہ ادا کیا گیا ہے، اس میں تقسیم بنگال اور نئے مسلم صوبہ کے قیام کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا تھا، جسے اس وقت مسلمانانِ ہند کے حال پر حکومت کا سب سے بڑا احسان سمجھا جا رہا تھا۔ یقین ہے کہ پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے مسودے میں اس کا خصوصیت سے ذکر رہا ہوگا، لیکن حکومت کی منظوری کے وقت اس حصے کو قلم زد کر دیا گیا ہوگا۔ کیوں کہ حکومت اپنی جگہ پر تقسیم بنگالہ کو منسوخ کر کے دونوں بنگال کو پھر ملا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ یہ سپاس نامہ یکم اپریل ۱۹۱۱ء کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کے ساڑھے آٹھ ماہ بعد، مسلمانوں سے کیے جانے والے وعدوں کو پس پشت ڈال کر، دہلی دربار کے موقع پر حکومت نے تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ اسی دربار کے لیے اقبال نے 'ہمارا تاجدار' کے عنوان سے مندرجہ ذیل اشعار کہے تھے، جو پہلے 'زمانہ' (کانپور) کے دربار شاہی نمبر (دسمبر ۱۹۱۱ء) میں اور پھر مخزن (لاہور) کی اشاعت جنوری ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئے[6]:

ہمائے اوجِ سعادت ہو آشکارا اپنا — کہ تاج پوش ہوا آج تاجدار اپنا
اسی کے دم سے ہے عزت ہماری قوموں میں — اسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا
اسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے — اسی کے خاکِ قدم پر ہے دل نثار اپنا

اقبال نے یہ اشعار تقسیم بنگالہ کی تنسیخ سے قبل کہے تھے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی برطانوی ہند کی راجدھانی کے کلکتہ سے دہلی منتقل کیے جانے کا بھی اعلان کیا گیا تھا جسے بھی بنگالیوں نے اپنی کامیابی سے تعبیر کیا تھا۔ تقسیم کی تنسیخ نے اسلامی ہند کے ذہن کو شدید جھٹکا لگایا، اور اس نے کم از کم وقتی طور پر، مسلم سیاست کا رُخ بدل دیا۔ اقبال کے ذہن پر اس کا جو اثر ہوا ہوگا اس کا مبہم سا اندازہ ان کی ایک تحریر سے ہوتا ہے۔ شاہی فرمان کے اجرا کے تین ماہ بعد انھوں نے عطیہ بیگم کو ایک خط لکھا۔ خط ختم کرنے کے بعد اس کی پشت پر انھوں نے مزید لکھا:

'تقسیم بنگالہ ہندو بنگال سے مسلم بنگال کی علاحدگی کے کو بنگالی ہندو نے یہ سمجھا تھا کہ حکومت نے بنگالی قومیت پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ لیکن حکومت نے دہلی کو راجدھانی بنا کر بڑی پُرکاری سے اپنے سابقہ فیصلے کو کالعدم کر دیا ہے۔ بنگالی یہ سمجھتا ہے کہ اس نے ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ مگر یہ بات اس کی عقل میں نہیں آتی کہ اس اقدام کے بعد اس کی اہمیت صفر کی حد تک گھٹ گئی ہے۔ اس کے متعلق دو شعر سُنیے:

"ہند مل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا ‏ ‏ ‏ ‏ وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
"تاج شاہی آج کلکتہ سے دہلی آ گیا ‏ ‏ ‏ ‏ مل گئی بابو کو جوتی، اور پگڑی چھن گئی"

ان دونوں شعروں کو اقبال نے بانگ درا میں شامل نہیں کیا تھا۔ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے اور تاج شاہی کے دہلی منتقل ہونے کے چھتیس سال بعد ۱۹۴۷ء میں اس وقت یہ اشعار منظر عام پر آئے جب کہ ایک عظیم تر تقسیم ہمارے ملک کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ بہر کیف اقبال جو نیا ذہن لے کر انگلستان سے لوٹے تھے اسے اگر سامنے رکھا جائے تو تقسیم بنگالہ کی تنسیخ پر ان کے یہ جذبات بے محل معلوم نہ ہوں گے۔

انگلستان سے واپسی کے چھ ماہ بعد ۲۰ مارچ ۱۹۰۹ء کو ایک خط کے جواب میں اقبال

نے لکھا تھا۔

"میں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اُٹھ جانا چاہیے۔ اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند ہوں، مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ ہندستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوب صورت ہے اور شعریت سے معمور ہے، تاہم موجودہ حالت اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ [سے] ناقابلِ عمل ہے۔"

بانگِ درا، کے تیسرے حصے کی دو ابتدائی نظمیں 'ترانۂ ملّی' اور 'وطنیت' بھی اقبال کی اسی ذہنی تبدیلی کا اعلان کرتی ہیں۔ 'ترانۂ ملی' کا پہلا بند ہے:

چین و عرب ہمارا، ہندستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اکبر الٰہ آبادی نے بقول فراق گورکھپوری، اس پوری نظم کا جواب ایک مصرع میں دیا تھا:

کچھ بھی نہیں ہمارا، وہم و گماں ہمارا

بانگِ درا میں 'ترانۂ ملی'، کے فوراً بعد 'وطنیت'، ملتی ہے، جس کا پہلا بند یہ ہے:

اس دَور میں مے اور ہے، جام اور ہے، جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور — تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

اقبال نے پہلے دور میں جس شدّت سے اس خیال کی تبلیغ کی تھی کہ:

خاکِ وطن کا مجھکو ہر ذرّہ دیوتا ہے

اسی شدت سے "وطنیت" میں اس کی تردید کردی۔ 'ترانۂ ملی' پر یوسف سلیم چشتی کا یہ تبصرہ صورت حال کو واضح کرتا ہے:

"جب اقبال نے 'وطنیت' (نیشنلزم) کے عقیدے کو ترک کیا اور اس کے بجائے قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق اسلام کو مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد قرار دیا، تو انھوں نے یہ ترانہ لکھا...!"

حوالے

۱. FAZL-i-HUSAIN: Azim Husain, p.53

۲. Ibid: p.60

۳. Ibid: p.97

۴. گم شدہ اوراق اقبال: محمد حنیف شاہد: نقوش (لاہور) اقبال نمبر: ستمبر ۱۹۷۷ء ص ۴۰۸

۵. پیسہ اخبار (لاہور) ۴ر اپریل ۱۹۱۱ء: بہ حوالہ نقوش (لاہور) اقبال نمبر ۲: دسمبر ۱۹۷۷ء: ۸۴ - ۴۸۰

۶. باقیات اقبال: مرتبہ عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی: ۲۰۶

۷. IQBAL: Atia Begum, p.77

۸. سفینۂ حیات: منشی غلام قادر فرخ: بہ حوالہ ذکر اقبال: عبدالمجید سالک ص: ۹۳

۹. 'آج کل' (نئی دہلی) اقبال نمبر: دسمبر ۱۹۷۷ء: ص ۵۴

۱۰. شرح بانگ درا: یوسف سلیم چشتی: ص ۲۷۶

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تقسیم بنگالہ کی تنسیخ، جس پر اقبال نے اپنی جھنجھلاہٹ اور غم و غصہ کا اظہار کیا تھا، ہندستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں، خصوصاً مسلمانانِ ہند کی بیداری کی تاریخ میں ایک اہم سنگِ میل ہے۔ حکومت کا "نہایت پُرکاری کے ساتھ اپنے ہی سابقہ فیصلے کو کالعدم" کر دینا، ایک ایسا اقدام تھا جس نے مسلمانانِ ہند کے بالائی طبقے کے قصرِ عبودیت کو بھی متزلزل کر دیا تھا اور عام مسلمانوں میں حکومت کی طرف سے شدید بدگمانی پیدا ہو گئی تھی۔ "۱۹۱۲ء کا زمانہ بھی ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ ایک یادگار زمانہ رہے گا۔ یہی زمانہ ہے جب مسلمانانِ ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں یکایک ایک انقلابِ عظیم رونما ہوا، اور قوموں کی زندگی میں جو تبدیلی بہ تدریج برسوں کے اندر پیدا ہوتی ہے، وہ بظاہر چند مہینوں کے اندر تمام قوم میں پیدا ہو گئی۔"

مسلمانانِ ہند کے خیالات میں یہ "انقلابِ عظیم" تقسیم بنگالہ ہی نے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ قومی ذہن رکھنے والے مسلمانوں نے حکومت کے اقدام کو ایک خداساز بات سمجھا تھا۔ مسلمانوں کے اسی نوزائیدہ جذبے کو پختہ کرنے کے لیے ابوالکلام آزاد نے کلکتہ سے 'الہلال' کا اجرا کیا۔

بعض اصحاب کا خیال ہے کہ "اقبال اور ابوالکلام کی فکر کے سوتے ایک ہی سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ اسی لیے وہ بڑے حصے میں دور تک ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں۔" یہ خیال صرف جزوی طور پر صحیح ہے۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد

بہت دور تک ساتھ ساتھ نہیں چلتے اور اس ہم سفری کا دائرہ بھی ابوالکلام آزاد کی مذہبی تحریک اور اس وقت کی اسلامی دنیا کے مسائل ہی تک محدود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں اقبال اور ابوالکلام کے افکار میں، یا یوں کہیے کہ 'بانگ درا' اور 'الہلال' کے افکار میں، ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس دور میں دونوں اتحاد اسلامی یا پان اسلامزم کے پُرجوش حامی تھے۔ بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے اور پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں دولت عثمانیہ کے انتشار نے دونوں کو یکساں متاثر کیا تھا اور دونوں نے اپنے اپنے انداز میں، اور اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق، ان واقعات پر اظہار خیال بھی کیا تھا۔

اقبال کی ان نظموں میں الہلال کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، جو ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۵ء کی درمیانی مدت میں کہی گئی تھیں۔ یہ بات ان نظموں کے بارے میں خصوصیت سے کہی جا سکتی ہے، جو بلقان اور طرابلس کی جنگوں کے واقعات سے متعلق ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات براہ راست 'الہلال' کی خبروں اور تصاویر ہی سے اخذ کیے گئے تھے۔ اس کی نہایت روشن مثال اقبال کی نظم "فاطمہ بنت عبداللہ۔ عرب لڑکی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی" ہے۔ یہ نظم محمد علی کے ہمدرد کے پہلے شمارے میں شائع ہوئی تھی، جس کا دہلی سے جون ۱۹۱۳ء میں اجرا ہوا تھا۔ اس سے چھ سات ماہ قبل الہلال میں "السیدہ فاطمہ بنت عبداللہ" کے عنوان سے ایک مصور مضمون شائع ہو چکا تھا، جس کی پیشانی کی عبارت یہ تھی:

"آج کے نمبر کے ساتھ ایک خاص صفحۂ تصویر کا شائع کیا جاتا ہے۔ مگر میں آنکھوں کا طالب نہیں ہوں جو اس کو دیکھیں، دل کا طالب ہوں جو اس کو پڑھیں۔ پھر کوئی ہے جو اپنے پہلو میں دل رکھتا ہو؟"

تصویر کے مقابل کے صفحہ پر مضمون دو صفحات پر پھیلا تھا۔ ہمدرد کے اجرا

کے تین ہفتوں کے بعد الہلال نے اس پر طویل تبصرہ کرتے ہوئے اقبال کی نظم کا بھی ذکر کیا:

"ہمدرد کے پہلے پرچے کے سرآغاز پر ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم تھی، جس میں اُنھوں نے ایک عرب مجاہد لڑکی کی شہادت کا واقعہ نظم کیا ہے۔ قارئین 'الہلال' کو یاد ہو گا کہ گذشتہ نومبر میں بسلسلۂ ناموران غزوہ 'طرابلس' ایک مضمون الاحیاء الذین لایموتون کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا۔ اس میں فاطمہ بنت عبداللہ نامی ایک یازدہ سالہ مجاہدۂ غیور عربیہ کے حالاتِ شہادت مع اس کے مرقع خونین کے شائع کیے گئے تھے۔ اسی واقعے کو ڈاکٹر اقبال نے اس نظم میں درج کیا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے زہرہ گداز اور عظیم الاثر حالات جو الہلال میں لکھے گئے ہیں، ان کے متعلق احبابِ کرام کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ذرائع علم اس درجہ نادر اور غیر معمولی ہیں کہ مصر و شام کے عربی اخبارات کا بھی ان پر دسترس نہیں ہے۔ چنانچہ فاطمہ بنت عبداللہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ شہادت مصر کے تمام مشہور و غیر مشہور جرائد میں سے کسی اخبار کو بھی نصیب نہ ہوا۔ ٹرکی میں صرف ایک ماہوار رسالے کو یہ حالات معلوم ہوئے تھے۔"

بانگِ درا کے شارح، یوسف سلیم چشتی نے لکھا ہے:

"اس شیر دل لڑکی کی شہادت کا حال میں نے ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں پڑھا تھا، جو اس زمانے میں مسلمانانِ ہند کے محبوب اور ان کی امیدوں کے مرکز جناب ابوالکلام کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔ دل تو چاہتا ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھوں، لیکن یہ بانگ درا کی شرح ہے، نہ کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ [۵]۔"

یہی بات اقبال کی نظم "حضور رسالت مآب" پر بھی صادق آتی ہے، جو لاہور

کے ایک جلسہ عام میں پڑھی گئی تھی۔ اس نظم کا جلسے پر جو اثر ہوا تھا، اس کا نقشہ حکیم محمد یوسف حسن، اڈیٹر نیرنگ خیال (لاہور) نے ایک مضمون میں پیش کیا ہے:

"... طرابلس پر اٹلی کے حملے کے خلاف ... شاہی مسجد لاہور میں مسلمانان لاہور نے ایک جلسہ کیا تھا ... اس جلسے میں مسلمانوں کے کئی لیڈر، بلکہ سب ہی لیڈر موجود تھے۔ سر شفیع، سر فضل حسین، میاں نظام الدین، مولوی محبوب عالم، میاں عبدالعزیز وغیرہ وغیرہ۔ اول چند رزولیوشن پڑھے گئے، اس کے بعد علامہ اقبال سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنا کلام سنائیں۔ ہجوم میں پندرہ بیس ہزار مسلمان ہوں گے۔ جوش کا یہ عالم تھا کہ جذبات کو قابو میں رکھنا محال ہو رہا تھا ...

"جب علامہ نے نظم سنائی شروع کی تو مجمع پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہو گیا ... ملاحظہ ہو علامہ اقبال کی نظم ...

"حضور رسالت مآب میں"

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
...

"فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
"حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو"

(۲)

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز
...

"نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
"ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا"

(۳)

"حضورِ دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے، وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

" علامہ نے جب پوری دلدوزی سے یہ شعر پڑھا
"مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے، جنت میں بھی نہیں ملتی
"تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہوا:.. اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا
"جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
"تو مجمع بے قابو ہو گیا۔ ہر چیخ و پکار، نالہ و بکا، آہ و فغاں سے مسجد کی دیواریں لرزنے لگیں۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے فضا گونجنے لگی لوگ پاگلوں اور دیوانوں کی طرح کپڑے پھاڑنے لگے، کوٹ اُتار کر پھینک دیے۔ پگڑیاں اور ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں۔ زمین پر اس طرح لوٹنے لگے جیسے کسی نے ان کو ذبح کر ڈالا ہو، میں نے اپنی زندگی میں کسی موت پر یا کسی بھی موقع پر، ایسا دلخراش منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ جلسہ خود بخود برخاست ہو گیا۔ لیڈرانِ عظام جلد از جلد اسٹیج سے کھسک گئے۔ عوام کا بے پناہ ہجوم مسجد سے باہر لپکا..."[۶]

اقبال کی یہ نظم بھی ممکن ہے الہلال ہی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہو، جس میں "کارزار طرابلس مسیحی تہذیب کا ایک منظر۔ طرابلس میں قتل عام" کے عنوان سے تصاویر اور مضمون

شائع ہوا تھا۔

'الہلال' سے اقبال کا محسوس اور غیر محسوس طور پر متاثر ہونا قطعاً حیرت ناک نہیں ہے۔ "اقبال نے آزاد کے خیالات کو پسند کیا۔ اس لیے کہ آزاد کے ابتدائی خیالات اقبال کے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔" الہلال کی ظاہری شکل وصورت کی دل فریبی سے قطع نظر وہ نئی زبان، نیا طرزِ تکلم اور نیا رنگ و آہنگ لے کر آیا تھا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں ہی کو نہیں، قدیم طرز کے عربی مدارس سے نکلے ہوئے علماء کو بھی گرویدہ بنا لیا مولوی فضل الدین احمد کے الفاظ ہیں:

"کلکتہ سے الہلال نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام ملک کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اُٹھ گئیں۔ اس کی ہر بات انقلاب انگیز تھی اور ہر بات نئی۔ ظاہری شکل وصورت بھی نئی اور باطنی محاسن بھی نئے ابھی دو چار نمبر ہی نکلے تھے کہ عام و خاص، ادنا و اعلا سب کی زبانوں پر اسی کا نام تھا... یکایک ملک کے تمام پچھلے رنگ مٹ گئے، اور ہر بات میں صرف اسی کا رنگ غالب آ گیا۔ لوگ بے اختیار اپنی راہیں چھوڑ کر اس کی راہ اختیار کرنے لگے..."

شبلی کو تو الہلال قدرتی طور پر عزیز تھا، لیکن اس بزم میں اکبر الٰہ آبادی بھی نظر آتے ہیں۔ ان کا تعلقِ خاطر اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے جو اپنے ایک مکتوب میں اڈیٹر 'الہلال' کو لکھا تھا:

"فروغِ حق کو نہ ہوگا زوال دنیا میں
ہمیشہ بدر بنے گا 'ہلال' دنیا میں"

اکبر الٰہ آبادی کا ایک "مراسلہ" اور ایک غزل بھی 'الہلال' کے صفحات میں موجود ہے۔

اقبال کو تو الہلال نے اس حد تک گرویدہ بنایا تھا کہ انھوں نے اس کی توسیع واشاعت کی مہم میں بھی نمایاں حصّہ لیا۔ اخبار کے اجرا کے تین ماہ بعد اڈیٹر نے ان اصحاب کا شکریہ ادا کیا تھا جنھوں نے بلا "تحریک وطلب" اخبار کی توسیع واشاعت کی کوشش کی تھی، اور ان لوگوں کے نام بھی درج کیے گئے تھے جنھوں نے دس یا اس سے زیادہ خریدار بنائے تھے۔ دس خریدار فراہم کرنیوالوں میں ڈاکٹر اقبال کا نام بھی ہمیں ملتا ہے۔[۱۳]

ابوالکلام آزاد نے اقبال کی ایک نظم بھی شائع کی تھی۔ اس کا عنوان تھا "نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی" نظم یہ ہے:

محل ایسا کیا تعمیر عرفی کے تخیل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

×

مرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی
تغیر آگیا ایسا مزاجِ اہل عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بارِ گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطفِ بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیوں کر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

×

صدا تربت سے آئی: شکوۂ اہل جہاں کم کن
نوا را تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

اقبال کی یہ نظم البلاغ کے پہلے شمارے کے پہلے صفحہ پر "ادبیات" کے عنوان کے تحت چھاپی گئی تھی۔ اس طرف اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب اخبار کے پہلے صفحہ پر نظم شائع کی گئی۔ الہلال اور البلاغ دونوں کے پہلے صفحے پر یا تو کوئی آیت قرآنی یا کوئی اہم تصویر چھاپی جاتی تھی اور دونوں کا متعلقہ شمارے کے کسی اہم موضوع سے تعلق ہوتا تھا۔ اس انحراف کے اسباب کو، نیز اس نظم کی شان نزول کو سمجھنے کے لیے الہلال کی جگہ پر البلاغ کے اجرا کے پس منظر کو سمجھنا ہوگا۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو الہلال کا اجرا ہوا۔ اس کے ابتدائی شماروں ہی نے اسلامی ہند میں ہلچل سی ڈال دی جسے تقسیم بنگالہ کی غیر متوقع تنسیخ نے تصویر حیرت بنا دیا تھا۔ الہلال کی زجرو توبیخ اور کڑوی کسیلی باتوں نے مسلمانوں کے متوسط طبقے میں اضطرابی کیفیت پیدا کر دی تھی جوق در جوق اس کی طرف دوڑنے لگے۔ مسلمانوں کے اس ردِ عمل کو حکومت نے بڑی اندیشہ ناک نظروں سے دیکھا۔ الہلال کے اجرا کے چودہ مہینے بعد بالآخر ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو اس نے پہلا حملہ کیا ناظرین کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا کہ حکومت بنگال نے:

"۱۸ر ستمبر کو دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی، جس میں ۲۷ر تاریخ تک داخل کرنے کی قید تھی۔ مگر آج ہی کہ (۲۳ ویں تاریخ ہے) دو ہزار روپے کے گورنمنٹ ضمانتی کاغذات عدالت میں بھیج دیے گئے۔ ضمانت کا روپیہ تو اسی تاریخ سے بطور امانت کے علاحدہ رکھ دیا گیا تھا، جس دن الہلال پریس کا سامان خریدنے کے لیے روپیہ نکالا تھا۔۔۔"[۱۴]

اس کے چودہ مہینے بعد حکومت نے دوسرا حملہ کیا جو نسبتاً کاری ثابت ہوا۔ اڈیٹر اس وقت کلکتہ میں موجود نہیں تھے، اس لیے سب اڈیٹر نے الہلال پریس کی ضمانت کی ضبطی، کی خبر سنائی:

"بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کرلی .. ایڈیٹر اتفاق سے دورے میں تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں ضبطی و خانہ تلاشی کا وارنٹ آیا۔ دفتر کی طرف سے اس واقعے کی ان کو اطلاع دی گئی، تو انھوں نے بذریعہ تار کے ہدایت فرمائی کہ جو نمبر چھپ رہا ہے اسے فوراً روانہ کردو، اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کردو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک الہلال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور ان شاء اللہ جاری رکھیں گے۔"[۱۵]

اس نوٹ میں 'الہلال' کو زندہ رکھنے کے عزم کا اگرچہ یقین دلایا گیا تھا، تاہم 'الہلال' دورِ اول کا یہی آخری شمارہ تھا۔ الہلال کے پرستاروں کے لیے یقیناً یہ ایک سخت سانحے سے کم نہ رہا ہوگا۔ گمان غالب ہے کہ اقبال کی یہ نظم بھی اسی تاثر کا نتیجہ رہی ہوگی، اور انھوں نے یہ نظم ابوالکلام آزاد کو بھیجی ہوگی۔ پورے ایک سال کے التوا کے بعد ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو 'الہلال' کی جگہ 'البلاغ' کا جب اجرا ہوا تو اسے اخبار کے پہلے شمارے کے پہلے صفحے کی زینت بنایا گیا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ نظم پڑھی جائے تو پوری صورتِ حال واضح ہوجاتی ہے۔

حوالے

۱۔ تذکرہ (مقدمہ از فضل الدین احمد: ص الف

۲۔ ابوالکلام آزاد: عابد رضا بیدار: ص ۲۲۹

۳۔ الہلال: جلد ۱ نمبر ۱۸: ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء

۴۔ ایضاً: جلد نمبر ۳ شمارہ ۳۵: ۱۶ر جولائی ۱۹۱۳ء

۵۔ شرح بانگ درا: یوسف سلیم چشتی: ص ۳۷۷

۶۔ علامہ اقبال کی شخصیت کے چند پہلو: حکیم یوسف حسن: نقوش (لاہور)
اقبال نمبر ۲ دسمبر ۱۹۷۷: ص ۴۰۔ ۳۹

۷۔ الہلال جلد ۱ نمبر ۵: ۱۱ر اگست ۱۹۱۲ء: ص ۱۱

۸۔ سرگذشت اقبال: خورشید عبدالسلام: ص ۱۷۷

۹۔ تذکرہ (مقدمہ): ص: د۔ ھ

۱۰۔ الہلال: جلد ۱ نمبر ۶: ۱۸ر اگست ۱۹۱۲ء

۱۱۔ ایضاً: جلد ۱ نمبر ۱۳: ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۱۲

۱۲۔ ایضاً: جلد ۲ نمبر ۱۳: ۲ر اپریل ۱۹۱۳ء ص ۲۱۸

۱۳۔ ایضاً: جلد ۱ نمبر ۱۳: ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء ص ۱

۱۴۔ ایضاً: جلد ۳ نمبر ۱۳: ۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء ص ۲۳۰

۱۵۔ ایضاً: جلد ۵ نمبر ۲۰: ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء ص ۳۸۳

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند!

اگست ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا یورپ میں آغاز ہوا، جو دیکھتے ہی دیکھتے عالم گیر بن گئی اور جلد ہی ایشیا کو بھی اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ہندستان چونکہ برطانوی مقبوضہ تھا اس لیے برطانوی حکومت نے اسے بھی اپنا حلیف بنا کر میدانِ جنگ میں اُتار دیا۔ جنگ کی گرم بازاری نے قدرتی طور پر ہندستانی سیاست گری کا بازار سرد کر دیا، اور حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ بھی برف خانے میں رکھ دیا گیا۔

ہندستانی مسلمانوں کا جہاں تک تعلق ہے اس جنگ نے شدید ذہنی کشمکش میں اُنھیں مبتلا کر دیا۔ عام حالات میں شاید ہندوؤں سے زیادہ خوش دلی سے وہ انگریزوں کا ساتھ دیتے، لیکن ترکی نے، جو خلافت اسلامیہ کا مرکز تھا، اس جنگ میں اتحادیوں کے خلاف جرمنی کا حلیف بننے کا فیصلہ کیا۔ خلیفۃ المسلمین کے اعلان جنگ اور شیخ الاسلام کے فتوے کے بعد ہندستانی مسلمانوں پر یہ لازم ہو جاتا تھا کہ اپنے انگریز حکمرانوں کے خلاف وہ بھی جرمنی کا ساتھ دیں، لیکن عملاً اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری طرف ہندستانی مسلمان اس خیال سے بھی سخت پریشان تھا کہ جنگ میں اتحادیوں کو اگر فتح نصیب ہوئی تو اسلامی خلافت ہی کو خطرہ لاحق نہ ہوگا بلکہ ان کے مقاماتِ مقدسہ بھی ترکی کے ہاتھ سے نکل کر اتحادیوں کے قبضے میں چلے جائیں گے۔

ان حالات نے مسلمانانِ ہند کو دوگونہ عذاب میں مبتلا کر دیا تھا، جس کا برطانوی حکومت کو بھی احساس تھا۔ اسی کے پیش نظر وزیر اعظم برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کو علانیہ یقین

دلایا تھا کہ جنگ میں اتحادیوں کو کامیابی ہوئی تو خلافت کو برقرار رکھا جائے گا اور مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کو ہاتھ نہ لگایا جائے گا۔ لیکن اس یقین دہانی کے باوجود مسلمانوں کی ہمدردیاں جرمنی ہی کے ساتھ رہیں۔ پانیر (الہ آباد) نے الہلال پر پرو جرمنزم کا الزام لگایا اور اس کے خلاف ایک طویل اداریہ لکھا۔ 'الہلال' نے مسئلہ وفاداری اور پانیر کے عنوان سے اس کا جواب دیا۔ اسی سلسلے میں اخبار کی دوبارہ ضمانت ضبط ہوئی اور وہ بند ہوگیا۔ سال بھر بعد الہلال کی جگہ پر البلاغ کا اجرا ہوا، لیکن وہ بھی چار ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ ۲۳ ر مارچ ۱۹۱۶ء کو ابوالکلام آزاد کو نظر بند کر[3] دیا گیا اور اسی کے ساتھ البلاغ بھی بند ہوگیا۔

ان ہی حالات کی بنا پر علی برادران کو اور دوسرے لیڈروں کو بھی نظر بند کیا گیا۔ قید و بند کا سلسلہ اختتامِ جنگ کے بعد بھی جاری رہا۔ علی برادران دسمبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں رہا ہوئے۔ ابوالکلام آزاد کا نمبر ان کے بعد آیا، وہ ۳۱ ر دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہا ہوئے۔[4]

جہاں تک اقبال کا تعلق ہے، سالک کے بیان کے مطابق، اس دور میں "وہ طبعاً بھی اور مصلحتاً بھی عملی سیاست سے علاحدہ رہے۔ بلکہ غیر سیاسی مجالس میں بھی نظر نہ آتے تھے۔"[5] دورانِ جنگ میں ملک کی سیاسی جماعتوں کے سالانہ اجلاس تو ہوتے رہے، لیکن سیاست کا بازار سرد ہی رہا۔ البتہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوئے اور ملک کے اقلیتی مسئلے پر ان دونوں میں ایک سمجھوتہ ہوگیا۔ اقبال نے علانیہ تو اس کی مخالفت نہیں کی، لیکن ان کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کا بیان ہے کہ وہ اس سمجھوتے کے خلاف تھے۔ اس کا ذکر خورشید عبدالسلام نے یوں کیا ہے:

"۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بیک وقت ہوئے۔ اور ان دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان پہلی اور آخری مرتبہ اس

مسئلے پر اتفاقِ رائے ہو گیا کہ مستقبل میں ہندستان کا آئینی ڈھانچہ کیا ہو اور اس میں مسلمانوں کو کیا مقام حاصل ہو . . . مسلمانوں کے لیے اس میں اطمینان بخش پہلو یہ تھے کہ کانگریس نے ان کے لیے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا تھا۔ یہ طے پا گیا کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں حاصل ہوں گی اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ اگر کسی مسودۂ قانون کو مجلسِ قانون ساز میں کسی قوم کے تین چوتھائی ارکان کی مخالفت پیش آئے تو وہ منظور نہیں ہو سکے گا، خواہ مجموعی طور پر اُسے ایوان کی اکثریت کی تائید ہی حاصل ہو۔ یہ بھی طے پا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اُنھیں پاسنگ (ویٹیج) یعنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت دی جائے گی۔ لیکن اس اصول کو غیر مسلم اقلیتوں پر لاگو کیا گیا تو پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت برابری یا اقلیت میں بدل گئی . . . سالک نے میثاقِ لکھنؤ کے سلسلے میں اقبال کی رائے یوں بیان کی ہے کہ "علامہ اقبال اس میثاق کے مخالف تھے، کیوں کہ اس کے ماتحت مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلمانوں کو موثر اقتدار نہ ملتا تھا اور مسلم اقلیت والے صوبوں میں پاسنگ کی وجہ سے ان کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچتا تھا۔ اس کے علاوہ علامہ کا خیال تھا کہ ایسا میثاق اُسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے کہ ہندستان میں قومیتِ متحدہ کی داغ بیل ڈالنا منظور ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ ہندستان میں قومیتِ متحدہ کی تعمیر ناممکن ہے۔ نہ اس کے لیے کوشش کرنا مفید ہے۔"[۹]

خورشید عبدالسلام نے میثاقِ لکھنؤ سے اقبال کے اختلاف کی عمارت اپنے والد

عبدالمجید سالک کی بیان کردہ روایت پر تعمیر کی ہے، جو علم سینہ پر مبنی معلوم ہوتی ہے ان دونوں نے اس خیال کی تائید میں کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

جنگ عظیم سے پیدا ہونے والے واقعات پر اقبال نے کوئی نظم کہی یا نہیں اور اس جنگ کے سلسلے میں اقبال کے جذبات و احساسات کیا تھے؟ ان سوالوں کا ہمارے پاس کوئی واضح جواب نہیں ہے۔ البتہ یہ ہمیں ضرور معلوم ہوتا ہے کہ وائسرائے کی طلب کردہ وار کانفرنس میں نیز لفٹیننٹ گورنر پنجاب کے منعقد کردہ جشن فتح میں اقبال نے شرکت کی تھی اور دونوں موقعوں پر نظمیں پڑھی تھیں۔ عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ:

"چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیر پر ہی رہے، اس لیے کہ بے حد پُر آشوب زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ظفر علی خاں اور بے شمار دوسرے علم بردارانِ اتحاد اسلامی قید و بند میں تھے۔ اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی شدید گرفت میں آجاتے اور کوئی نتیجہ بھی برآمد نہ ہوتا۔ بلکہ جب اواخر جنگ میں وائسرائے نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بہ طورِ خاص نواب ذوالفقار علیخاں کی وساطت سے علامہ اقبال کو بھی طلب کیا۔ اور اس موقع کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھا جس کے کل نو بند ہیں . . ." اقبال نے "یہ نظم یونیورسٹی ہال میں بھی سنائی تھی"۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند — روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند — تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقّر قبول ہو

اختتام جنگ پر جرمنی و ترکی کی شکست کا اور اتحادیوں کی فتحمندی کا جشن سلطنت برطانیہ کے کونے کونے میں منایا گیا۔ "مسلمانوں نے اس کا مکمل مقاطعہ کیا اور ہندوؤں نے بھی ان کے ساتھ تعاون کیا۔" لیکن لاہور میں منعقد ہونے والے جشن میں اقبال نے شرکت کی اور نظم بھی سُنائی۔ اس سلسلے میں دو بیانات ہم کو ملتے ہیں، جن میں جزوی حذف و اضافہ کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایک بیان عبدالمجید سالک کا ہے اور دوسرا غلام جیلانی برق کا۔ دونوں عینی شاہد ہونے کے مدعی ہیں۔ سالک نے لکھا ہے:

"۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ ۵ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو سر مائیکل اوڈوائر لفٹیننٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا، جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں... فارسی کے چند اشعار بھی سنائے۔ چونکہ راقم الحروف اس جلسے میں موجود تھا اس لیے یہ اشعار درج ذیل ہیں...[۸]"

دوسرا بیان غلام جیلانی برق کا ہے:

"... پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر برطانوی امپائر میں آسٹریا سے کنیڈا تک ہفت روزہ جشن منایا گیا۔ لاہور میں بھی بڑے کھیل تماشے ہوئے... چوں کہ میں اُن دنوں لاہور میں تھا اس لیے بیشتر اجتماعات اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ جشن کے ساتویں دن پنجاب کے گورنر اوڈوائر نے لاہور کے ایک ہزار اکابر کو عصرانے پر بلایا۔ ان میں اقبال بھی شامل تھے۔ گورنر نے تین چار روز پہلے اقبال کے ایک نہایت مخلص دوست سر ذوالفقار علی خاں کو تاکید کی تھی کہ

وہ علامہ اقبال سے جشن فتح کے سلسلے میں ایک نظم لکھوائیں۔۔۔ وہ گورنر ہاؤس سے نکل کر سیدھے اقبال کے یہاں گئے، اور بات بتائی۔ اقبال نے کہا ایسا کرنا میری موت ہے۔۔۔ سر ذوالفقار علی کسی طرح اپنے مطالبے سے دستبردار ہونے پر تیار نہ ہوئے تو اقبال نے اس شرط پر حامی بھر لی کہ وہ اس کی نقل کسی کو نہیں دیں گے اور نہ کسی جریدے میں شائع ہو گی۔ اتنی احتیاط کے باوجود دوسرے روز ایک اخبار میں شائع ہو گئی۔۔۔" ۹

سالک اور برق دونوں نے لفظی اختلاف کے ساتھ پانچ شعر کی یہ نظم نقل کی ہے۔

ہیچ می دانی کہ صورت بند ہستی با فرانس
فکر رنگین و دلِ گرم و شراب ناب داد

روس از سرمایۂ جمعیتِ ملت ربود
قہر او کوہِ گراں را لرزشِ سیماب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بہ انگلستاں سپرد
جرمنی را چشم حیران و دلِ بے تاب داد

تا برانگیزد نوائے حریت از سازِ دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خورد فطرت از جنابِ او ببرد
بہر ما چیزے نماندہ خویش را با ما سپرد

ان واقعات کی تفسیر و تعبیر جو بھی کی جائے، لیکن یہ دعوا کوئی بھی شاید نہ کرے گا کہ یہ ساری باتیں اقبال نے بہ رضا و رغبت کی تھیں۔ اس میں سب سے زیادہ دخل جبر کو تھا۔ یہ جبر خواہ سرکار کا رہا ہو یا سرکار پرستوں کا، یا خود ان کے حالات کا۔ اوائل جنگ میں ایک خط کے جواب میں انھوں نے لکھا تھا:

"اقبال عزلت نشین ہے، اور اس طوفانِ بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہلِ دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے، مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔۔۔" ۱۰

خورشید عبدالسلام کا یہ خیال قرین صحت ہے کہ اقبال اس حقیقت سے خوب آگاہ تھے کہ پہلی عالم گیر جنگ کن مقاصد سے لڑی گئی تھی۔۔۔ حالات سے مجبور ہو کر انھیں

جنگ کے سلسلے میں منعقدہ دو تقریبات میں شریک ہونا پڑا۔ دہلی کی وار کانفرنس میں اپنے دوست نواب ذوالفقار علی خاں کے اصرار پر شریک ہوئے اور ایک نظم بھی پڑھی لیکن اسے بانگ درا میں شامل نہ کیا... لاہور میں سرمائیکل اڈوائر کی صدارت میں جلسۂ فتح منعقد ہوا اس میں بھی شامل ہونا پڑا۔ لیکن جنگ کے دوران میں ترکیہ پر جو بپتا پڑی تھی اس کے پیشِ نظر وہ اظہارِ شادمانی نہیں کر سکتے تھے''۔

دورانِ جنگ میں ہندستان کا سیاسی مطلع بہ ظاہر پرسکون رہا تھا، یا اسے جبراً پرسکون رکھا گیا تھا، لیکن یہ سکون ایک نئے اور عظیم طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ چنانچہ جنگ ختم ہوتے ہی سارے بندھ ڈھیلے پڑ گئے اور یہ طوفان آندھی پانی کی طرح پورے ملک پر چھا گیا۔ اقبال نے دورانِ جنگ میں جو سیاسی روش، مجبوراً یا مصلحتاً اختیار کی تھی، اس کے پیشِ نظر یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ بعد جنگ کے دور میں بھی وہ "منقار زیرِ پر" ہی رہے۔ اس دور میں جو سیاسی حالات پیدا ہوئے انھوں نے بلا استثنائے مذہب و ملت، برصغیر کے تمام بسنے والوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طوفانی صورت حال سے عہدہ برا ہونے کی جو راہ ہندستانی عوام نے اختیار کی، اقبال کے ذہن نے اُس راہ پر گامزن ہونے سے انکار کر دیا۔ یہ اُسی کا نتیجہ تھا کہ خلافت اور آزادی ہند کی مشترکہ تحریک میں اقبال کوئی حصہ نہ لے سکے اور اپنے ہم وطنوں خصوصاً اپنے ہم مذہبوں، کے غم و غصے کا شکار رہے۔

حوالے

۱۔ الہلال: اداریہ: جلد پنجم نمبر ۱۲: ۱۶ ردسمبر ۱۹۱۴ء

۲۔ البلاغ کا پہلا شمارہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو آخری شمارہ ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو شائع ہوا

۳۔ تذکرہ: ابوالکلام آزاد: (پہلا اڈیشن): ص ۳۱۰

۴۔ INDIA WINS FREEDOM: Abul Kalam Azad, p.8
۵۔ ذکر اقبال : عبدالمجید سالک : ص ۱۰۲
۶۔ سرگذشت اقبال : خورشید عبدالسلام : ص ۲۲ - ۱۲۰
۷۔ ذکر اقبال : ص ۷ - ۸۶
۸۔ ایضاً : ص ۹۰
۹۔ میں اور اقبال : غلام جیلانی برق : بہ حوالہ اوراق گم گشتہ : ص ۹۶ - ۱۹۵
۱۰۔ ذکر اقبال : ص ۱۰۱
۱۱۔ سرگذشت اقبال : ص ۴ - ۱۳۴

خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

جشنِ فتح کے شادیانوں کی آوازیں ابھی فضا میں تحلیل بھی نہ ہونے پائی تھیں کہ ہندستان کی سیاست نے انگڑائی لے کر ایک نئی کروٹ لی اور ملک کے گوشے گوشے میں طبلِ جنگ کی صدائیں گونجنے لگیں۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کا سنگم ہندستان کی جدوجہد آزادی کا اہم ترین موڑ تھا۔ یہ تو ہم پچھلے صفحوں میں بھی دیکھ چکے ہیں کہ جنگ کے آغاز ہی سے خلافت اسلامیہ کے وجود کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ اختتام جنگ نے اس خطرے کو جیتی جاگتی شکل دے کر مسلمانانِ ہند کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ترک موالات کا، یا جدوجہد آزادی ہند کی تحریک کا زمانہ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں شروع ہوا۔ ان دونوں عظیم تحریکوں کے سنگم سے پہلے صورتِ حال یہ تھی کہ مسلمان معتدلین بھی ترکی کی حمایت میں جلسے کرتے تھے، اور ہندستانی مسلمانوں کو صبر و ضبط کی اور سارے معاملے کو خدا کے حوالے کر دینے کی صلاح دیتے تھے۔ "دسمبر ۱۹۱۹ء کے اواخر میں باغ بیرون موچی دروازہ (لاہور) میں ایک جلسۂ عام ہوا جس کی صدارت میاں فضل حسین نے کی اور علامہ اقبال نے نمایاں حصہ لیا۔" اور قرارداد بھی اقبال ہی نے پیش کی۔" حضرت علامہ نے اس قرارداد کے حق میں جو تقریر فرمائی، اس کا متن ملاحظہ ہو۔

"صاحبان! جس قوم نے دنیا میں آزادی و حریت کی اشاعت کی تھی، آج اس کی آزادی چھینی جا رہی ہے۔ جب بنی نوع انسان کو پامال کیا جاتا تھا، اس وقت اس قوم نے مساوات کا پرچار کیا تھا۔

"مسلمانو! تم کو یاد ہے جب عرب میں نبی آخرالزماں پیدا ہوئے، اس وقت دنیا کی کیا کیفیت تھی۔ قسطنطنیہ میں قیصر کی سختی یورپ کی قوموں کا گلا گھونٹ رہی تھی۔ اس وقت یہ امر واضح کیا گیا کہ خدا کی اطاعت کے سوا اور کسی کی اطاعت نہ کی جائے۔ تمھارا مذہبی عقیدہ ہے کہ انسان کو آزادی ملنی چاہیے۔ آج وہ قوم دوسری قوموں کے سامنے یہ کہہ رہی ہے کہ جن اصولوں کا اعلان کر کے میں نے بنی نوع انسان سے فیصلہ کیا تھا، ان ہی اصولوں کو میرے ساتھ بھی برتا جائے۔ ہوگا تو وہی جو نبیؐ آخرالزماں فرما گئے ہیں، مگر اس بات کا ترک کرنا بھی مناسب نہیں ہم کیوں کسی بندے کے سامنے شکایت کریں۔ ہمیں خدا کے سامنے شکایت کرنی چاہیے، خوشامد منت اور مانگنے سے کبھی کچھ نہیں ملا۔ خدا کے سوا کسی کی اطاعت ہمارے لیے واجب نہیں ...[1]"

قرارداد کا متن بھی مندرجہ بالا تقریر سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ معاملے کو خدا اور رسول پر چھوڑنے کی جگہ، برحکومت برطانیہ کو اس کے وعدے یاد دلانے کے بعد "بہ اصرار تمام درخواست" کی گئی تھی کہ "سلطنت عثمانیہ کے کسی حصے پر صراحتاً یا اشارتاً کسی دوسری سلطنت کا قبضہ نہ ہونا چاہیے۔"[2]

دسمبر ۱۹۱۹ء کے متذکرہ بالا جلسے میں اقبال نے جو تقریر کی تھی، اس سے چند مہینے بعد بھی اُنھوں نے یہی خیالات اشعار میں ظاہر کیے تھے، جو بانگِ درا میں 'دریوزۂ خلافت' کے عنوان سے ملتے ہیں:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی

"مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

مندرجہ بالا اشعار کو، اور اقبال کی تقریر کو بھی، ان کے دلی احساسات و جذبات نہیں کہا جا سکتا۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں اقبال نے خطاب کی مبارکباد کے جواب میں، مولوی عبدالماجد دریابادی کو لکھا تھا کہ "اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔" اور یہی وہ مسلمانوں سے بھی چاہتے تھے کہ وہ بھی "کھلی کھلی جنگ" سے گریز کریں۔

"کھلی کھلی جنگ" اقبال کی فطرت سے زیادہ ان کے مصالح کے خلاف تھی، اور خود ان کے مصالح سے زیادہ ان کے دوستوں کے مصالح کے خلاف تھی جن میں وہ گھرے رہتے تھے۔ اقبال قومی حادثات سے متاثر بھی ہوتے تھے اور اپنے تاثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے بھی تھے۔ لیکن مصلحتاً وہ ان کو شائع نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس کی بہت اچھی مثال ان کے یہ دو شعر ہیں:

ہر زائر چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ پاک ‏ غافل نہ رہ جہان میں گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم ‏ تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس نہال سے

کہا جاتا ہے اور غالباً صحیح کہا جاتا ہے کہ یہ اشعار جلیانوالہ باغ کے قتل عام سے متاثر ہو کر کہے گئے تھے، لیکن وہ کسی جگہ شائع نہیں ہوئے اور بانگ درا، میں بھی انھیں شامل کرنا اقبال نے خلافِ مصلحت سمجھا۔ گمان غالب ہے کہ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے بارے میں بھی اقبال نے اشعار ضرور کہے ہوں گے، لیکن وہ سب نذرِ احتیاط ہو گئے۔ بہرکیف اقبال کے سکوت مسلسل نے ان کے عام شیدائیوں ہی کو نہیں بلکہ ان کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والوں کو بھی جن میں ظفر علی خاں بھی شامل تھے، حیران کر دیا تھا۔ چنانچہ ظفر علی خاں ہی کے اخبار زمیندار میں منظوم "پیام عرشی امرتسری بنام

اقبال" شائع ہوا، جو گیارہ اشعار پر مشتمل تھا۔ ابتدائی سات شعروں میں اقبال کے "ترنم ہائے رنگیں" کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد عرشی نے انھیں للکارا تھا:

اے تو ٹی در آشیان و گلشنت بر باد رفت — نغمہ ماندی و پروازِ تو با صیاد رفت
خیز و گلبانگ دہل در گنبدِ خضرا فگن — از قبور آیند خلقے، شورِ صورآسا فگن
خیز و صوتِ خود بآہنگِ رجز تبدیل کن — قطرہ داری بیا و در شرر تحلیل کن
خیز زیں گنجِ متانت جلوہ بر ما فگن
ہاں بیا "ہم چوں سنائی گوئے در میداں فگن"

جوابِ اقبال:

دانی کہ چیست شیوۂ مردانِ پختہ کار — عرشی! گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست
دارم ہنوز از کرمِ ساقیِ حجاز — آہے درونہ تاب کہ خیزد ز سینہ مست
از شاخسارِ فطرتِ من می دمد ہنوز — آں لالۂ کہ موجِ نسیمے دلش نہ خست
لیکن شنیدۂ کہ دمِ گردشِ شراب — پیرِ عجم چہ گفت بر نداں مے پرست
"دانا کہ دید شعبدۂ چرخِ حقہ باز
ہنگامۂ بازچید و درِ گفتگو ببست"

۲۶ رمئی ۱۹۲۰ء

عرشی و اقبال کی قیل و قال پر ظفر علیخاں کا محاکمہ:

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی — بیرِ فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج — پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
لیکن نہ قولِ سعدیِ شیراز بھولیے — چھوٹا نہ ہو جو ہاتھ سے سر رشتہ الست
"رفتن بپائے مردیِ ہمسایہ در بہشت
حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است" ۵

اس مکالمے میں ایک بزرگ طغرائی امرت سری نے بھی حصہ لیا۔[6] ان کے چار شعر یہ ہیں:

امروز در فضلائے زمیندار دیدہ ام
زاقبال پاسخے کہ دلِ آرزو بہ خست

نادیدہ خاطرم بہ خطابِ تو وا رسید
نشنیدہ مدعائے تو در ذہنِ من نشست

باشد برائے دیدۂ بینا مقام حیف
گر کور در چاہ دید و صدائیش نداد است

یگرم کہ گنجِ فلسفۂ حکمت است کس
اما چہ سود مہرِ سکوت او لبش بہ بست

اسباب جو بھی رہے ہوں، لیکن بہ ظاہر اقبال خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں کے حق میں نہیں تھے، اور انھیں مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے ایک مراسلے سے ہوتا ہے جو زمیندار (لاہور) کی اشاعت مورخہ ۸ ارنومبر ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مراسلے میں انھوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ:

"مسلمانوں کے لیے نہ مسٹر گاندھی کی زندگی اسوۂ حسنہ ہے اور نہ کسی انسان کا بنایا ہوا ہدایت نامہ ان کے لیے دلیلِ راہ ہو سکتا ہے۔ ان کے اپنے ہر فعل کے لیے، خواہ انفرادی ہو خواہ اجتماعی کتاب اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام کار میں تلاش کرنا چاہیے... اور اس بات کا خیال بھی نہ کرنا چاہیے کہ ان کا نظامِ عمل مسٹر گاندھی کے پروگرام کے مطابق ہے، یا اس سے مختلف...."

اسی مراسلے میں اقبال نے ایک تجویز بھی پیش کی تھی، جسے انجمن حمایت اسلام (لاہور) نے قرارداد کی شکل میں منظور کر لیا تھا۔ تجویز یہ تھی:

"انجمن حمایت اسلام اپنے طور پر علمائے پنجاب و ہندستان کی ایک کانفرنس منعقد کرے، جس میں واقف کار لوگ بہ طور مشیر کام کریں۔ اس کانفرنس میں مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور ہو...

جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو اس وقت تک اسلامیہ کالج کا الحاق [پنجاب] یونیورسٹی سے برقرار رہے۔[۸]"

مندرجہ بالا اقتباس کے آخری جملے میں جو بات کہی گئی ہے، وہ ہی اس مراسلے کی محرک تھی۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ اسلامیہ کالج انجمن حمایت اسلام کا قائم کردہ اور اسی کے زیر اہتمام تھا۔ ۱۹۲۰ء میں اقبال اور ان کے دوستوں کا انجمن پر قبضہ تھا۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں انجمن کے صدر، اقبال جنرل سکریٹری اور اسلامیہ کالج کی انتظامیہ کمیٹی کے صدر میاں فضل حسین تھے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں، جو جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی تھیں، ان سے اسلامیہ کالج کے طالب علموں کا محفوظ رہنا ممکن نہیں تھا۔" اسلامیہ کالج کے طلبہ کو تحریکِ خلافت سے جو دلچسپی تھی اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جنوری ۱۹۲۰ء میں ایک کمیٹی بنائی، جس میں دوسرے کالجوں کے مسلمان طلبہ بھی شامل تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ مرکزی خلافت کمیٹی کے فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ چنانچہ ۱۵ر جون تک ایک ہزار چار سو تینتالیس روپے جمع ہوئے۔ جن میں سے ایک ہزار تین سو باون روپے مرکزی فنڈ کو بھیجے گئے۔ اسی سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کالج کا پنجاب یونیورسٹی سے الحاق برقرار رکھا جائے یا نہیں، نیز یہ کہ کالج کو جو سرکاری امداد مل رہی ہے، اسے قبول کیا جائے یا مسترد کر دیا جائے۔ وقتی طور پر کالج بند کر دیا گیا۔

"اس مسئلے پر انجمن کی کونسل کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں کافی بحث کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ یونیورسٹی سے الحاق برقرار رکھا جائے اور سرکاری امداد کا سلسلہ بھی جاری رکھا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے پرنسپل ہنری مارٹن نے کالج کھول دیا اور جن آٹھ طالب علموں نے ترکِ موالات میں نمایاں حصہ لیا تھا، انھیں کالج چھوڑنے کا حکم دیا۔ انھوں نے [کالج چھوڑنے سے] انکار کیا تو کالج کمیٹی نے انھیں معطل کر دیا۔ اس

پر کالج میں ہڑتال ہوگئی۔ اسی دن لاہور میں ایک جلسۂ عام ہوا، جس میں طلبہ سے بدسلوکی کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ جلسے کی طرف سے ایک وفد علامہ اقبال سے ملا، اور معطلی کی کارروائی کے بارے میں دریافت کیا تو علامہ نے کہا کہ میں پرنسپل کی کارروائی کو سخت نا واجب سمجھتا ہوں، لیکن کالج کمیٹی کے اندرونی معاملات میں مداخلت سے قاصر ہوں۔ اس پر وفد میاں فضل حسین سے ملا، مگر وہاں سے بھی مایوس کن جواب ملا۔ کالج میں ہڑتال کی وجہ سے حالات اتنے ابتر ہوگئے کہ پرنسپل ہنری مارٹن کو معزول کرنا پڑا۔"[۱]

لاہور کے اسلامیہ کالج میں پیدا ہونے والے واقعات ایک وسیع اور ملک گیر تحریک کا حصہ تھے۔ اسی نوع کی، لیکن اس سے عظیم تر صورتِ حال سے سرسیّد احمد خاں کا قائم کردہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج بھی دوچار تھا جہاں خلافت اور ترکِ موالات کی مشترکہ تحریک کے داعیوں نے 'مسلم نیشنل یونیورسٹی' کے نام سے ایک متوازی تعلیمی ادارہ قائم کر دیا تھا، جس کا دوسرا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا۔ ام۔ اے۔ او کالج کے ایک ممتاز اولڈ بوائے مولانا محمد علی، کے علاوہ مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں اور مختار احمد انصاری اس نومولود تعلیمی ادارے کے قیام میں پیش پیش تھے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ نذیر نیازی کی روایت کے مطابق قیام جامعہ کے وقت "مولانا محمد علی نے حضرت علامہ سے بھی درخواست کی تھی کہ لاہور چھوڑ کر علی گڑھ آجائیں اور جامعہ کی زمام تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں۔ حضرت علامہ نے بوجوہ مولانا کی یہ درخواست منظور نہیں کی۔"[۱]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زمیندار (لاہور) میں شائع ہونے والے ڈاکٹر اقبال کے مراسلے کی اشاعت

کے دو دن بعد، ۲۲ نومبر ۱۹۲۰ء کو، جامعہ ملیہ کی فاؤنڈیشن کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ "ڈاکٹر" اقبال صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ "اس نئے ادارے کی [پرنسپلی قبول کریں]"۔ اس کی اطلاع اقبال کو تار سے دی گئی، اور مہاتما گاندھی نے مندرجہ ذیل خط بھی انہیں لکھا:

"مسلم نیشنل یونیورسٹی [جامعہ ملیہ اسلامیہ] آپ کو آواز دے رہی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ اسے اگر اپنے ہاتھ میں لے لیں تو آپ کی فاضلانہ قیادت میں یہ ترقی کر سکے گی۔ حکیم اجمل خاں کے علاوہ علی برادران کی بھی یہی دلی خواہش ہے۔ میری آرزو ہے کہ آپ اس آواز کو لبیک کہیں آپ کے اخراجات، جو نئی بیداری کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گے بہ آسانی فراہم کیے جا سکیں گے۔ براہ نوازش اس کا جواب پنڈت [موتی لال] نہرو کی معرفت الہ آباد کے پتے پر روانہ فرمائیے۔"[۱۳]

اقبال کے جواب سے جو آگے نقل کیا جا رہا ہے، اندازہ ہوتا ہے کہ نومبر کے تیسرے ہفتے میں گاندھی جی نے یہ خط انھیں لکھا ہوگا۔ گمان غالب ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی متعلقہ کمیٹی نے جب اقبال کو تار دیا تھا اور گاندھی جی نے جب خط لکھا تھا، اس وقت تک ان میں سے کسی کو بھی اقبال کے اس مراسلے کا علم نہ رہا ہوگا، جو ۱۸ نومبر کے 'زمیندار' میں شائع ہوا تھا۔ اگر ان حضرات کو اس کا علم ہوتا تو گاندھی جی یا تو یہ تجویز اقبال کے سامنے پیش ہی نہ کرتے، یا پھر ان کے خط کی عبارت بالکل مختلف ہوتی۔ بہر کیف یہ حیرت ناک نہیں ہے کہ اس "آواز کو لبیک" کہنے پر اقبال اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکے۔ انھوں نے لکھا:

"نوازش نامے کا بے حد شکریہ، جو پرسوں ملا۔ مجھے بے انتہا افسوس ہے کہ ان اصحاب کی آواز کو لبیک کہنے سے میں قاصر ہوں،

جن کی میں حد درجہ عزت کرتا ہوں۔ اس کے اسباب بیان کرنا فی الحال ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ قومی تعلیم کا میں زبردست مؤید ہوں، تاہم میں یہ نہیں سمجھتا ہوں کہ مجھ میں وہ تمام صفات موجود ہیں جو کسی ایسی یونیورسٹی کی رہنمائی کے لیے ضروری ہیں، جسے اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں ہر طرح کی جدوجہد اور رقابتوں کا سامنا ہونے کا امکان ہو، اور پھر طبعاً میں امن و آشتی ہی کی فضا میں کام کرنے کا اہل ہوں[۱۴]۔"

اتنا لکھنے کے بعد اقبال نے یہ تجویز پیش کی تھی:

"ایک مزید بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو موجودہ حالات ہیں اُن کے پیش نظر سیاسی آزادی سے پہلے ہمارے لیے معاشی آزادی کا حصول ضروری ہے۔ اور اس میدان میں مسلمانانِ ہند، ملک کے اور فرقوں کے مقابلے میں، بہت پس ماندہ ہیں۔ انھیں بنیادی طور پر ادب و فلسفہ کی نہیں، بلکہ ٹیکنیکل تعلیم دینے کی ضرورت ہے جو انھیں معاشی طور پر آزاد کر سکے گی۔ چنانچہ فی الحال اسی موخرالذکر طرز تعلیم پر اُنھیں اپنی تمام قوتوں کو مرکوز کر دینا چاہیے۔ جن اصحاب نے علی گڑھ کی اس جدید یونیورسٹی کی طرح ڈالی ہے، وہ اگر ایک ایسا ادارہ تعمیر کر سکیں تو بہتر ہے جو طبعی علوم کے فنی پہلوؤں کی تعلیم کے لیے خاص طور سے وقف ہو۔ البتہ اس میں مذہبی تعلیم کا بھی حسب ضرورت اضافہ کر دیا جائے[۱۵]۔"

اس تجویز کی معقولیت کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ضرورت تو پہلے بھی موجود تھی، اور اُنھوں نے لاہور کے اسلامیہ کالج کو 'ادب اور فلسفہ' کی جگہ پر فنی تعلیم کے لیے وقف کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی؟ اس خط کے

آخری حصے میں اقبال نے لکھا تھا۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیائے اسلام میں خصوصاً عربستان اور مقامات مقدسہ میں، جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان کے پیش نظر مسلمانان ہند عدم تعاون کے کسی طریقے کو اختیار کرنے میں اپنے کو حق بجانب سمجھیں گے لیکن تعلیمی "مقاطعہ" کے مذہبی پہلو کی بابت میرا ذہن ابھی تک صاف نہیں ہے، اور اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کے لیے اپنی تجاویز میں نے شائع کردی ہیں۔ اگرچہ میں شرع کا ماہر نہیں ہوں، تاہم یہ میرا عقیدہ ہے کہ ہماری موجودہ معذوریوں کے باوجود، اس تعلیمی مسئلے کے باب میں شریعت ہماری رہنمائی کرنے سے قاصر نہیں رہ سکتی۔" حوالہ نمبر ۱۵

یہ قصہ اواخر نومبر ۱۹۲۰ء کا تھا۔ اقبال کے مندرجہ بالا جواب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تحریک ترکِ موالات کے ابتدائی دور میں اقبال کا ذہن اس تحریک کے بارے میں صاف نہیں تھا، بلکہ بڑی حد تک وہ اس کے خلاف تھے۔ لیکن یہ اندازِ فکر زیادہ دنوں تک ان کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اس کا اندازہ ان کی اس مختصر سی نظم سے ہوتا ہے جو اس قصے کے پورے ایک سال بعد ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کے روزنامہ 'زمیندار' میں شائع ہوئی تھی اور جس میں گاندھی جی کو 'مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا' کہا گیا تھا۔[۱۶] نظم یہ تھی :

گاندھی سے ایک روز یہ کہتے تھے مالوی
کم زور کی کمند ہے دنیا میں نارسا

نازک یہ سلطنت صفتِ برگِ گل نہیں
لے جائے گلستاں سے اڑا کر جسے صبا

گاڑھا ادھر ہے زیبِ بدن اور ادھر زرہ
صرصر کی رہ گزار میں کیا عرضِ توتیا

پس کر ملے گا گردِ رہِ روزگار میں
دانا جو آسیا سے ہوا قوت آزما

بولا یہ بات سن کے کمالِ وقار سے
وہ مردِ پختہ کار و حق اندیش و باصفا

خارا حریفِ سعی ضعیفاں نمی شود
صد کوچہ الیست در بن دنداں خلال را

ترکِ موالات کی تحریک چوری چورا کے تشدد آمیز حادثے کے بعد، ناکامی پر ختم ہوئی تھی، لیکن ہندستانی عوام نے اس تحریک کے سلسلے میں جس پامردی کے ساتھ برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا تھا، اس نے اقبال کے دل و دماغ کو بھی بے طرح متاثر کیا تھا۔ ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

"ہندستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ لتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ امم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ، جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں، اس کی عظمت و اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آیندہ نسلیں اس کی تاریخ کو پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔" [۱]

حوالے

۱۔ سرگذشت اقبال: خورشید عبدالسلام: ص ۱۴۴ - ۱۴۵

۲۔ ایضاً: ۱۴۳

۳۔ ایضاً: ص ۱۶۱

۴۔ باقیات اقبال: مرتبہ عبدالواحد معینی و عبداللہ قریشی: ص ۲۳۸

۵۔ ایضاً ص ۲۴۷ - ۲۴۹، نیز اوراق گم گشتہ مرتبہ رحیم بخش شاہین: ص ۲۰۱-۲۰۳

۶۔ اوراق گم گشتہ ص ۲۰۲ - ۲۰۳۔

۷۔ بہ حوالہ سرگذشت اقبال: ص ۱۹۴

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً: ۱۹۲

۱۰۔ ایضاً: ۱۹۳

۱۱۔ مکتوبات اقبال: نذیر نیازی: ص ۳

۱۲۔ اقبال اور جامعہ: عبداللطیف اعظمی: رسالہ جامعہ اقبال نمبر مارچ ۱۹۷۸ء ص: ۷

۱۳۔ COLLECTED WORKS OF MAHATMA GANDHI: Vol.19, p.34

۱۴۔ GANDHI PAPERS, GANDHI SAMARAK NIDHI, New Delhi, S.No.7330, Nov.29, 1920

۱۵۔ Ibid

۱۶۔ بہ حوالہ سرگذشت اقبال: ص ۱۵۰۔۵۱

۱۷۔ ایضاً ص ۱۵۱

اے ز افسونِ فرنگی بے خبر!

بانگ درا میں تو نہیں، لیکن باقیات اقبال' میں اقبال کے یہ اشعار ملتے ہیں:

انتی خدمت کی ہے خلق اللہ کی
دیکھیے ہوتے ہیں کب "سر" مالوی

مسلمِ ناداں کو کیا معلوم ہے
کس خدا کے ہیں پیمبر مالوی

یہ اشعار اقبال نے کب اور کیوں کہے تھے؟ اس کا ہمیں علم نہیں ہے لیکن ۱۹۲۳ء میں خود اقبال 'سر' ہو گئے۔ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں سے اقبال کی لاتعلقی نے اور ان تحریکوں کے باب میں ان کے سکوت مبہم نے ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں ان کی طرف سے شکوک پیدا کر دیے تھے۔ اس پر طرّہ یہ ہوا کہ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکیں مدھم بھی نہ پڑنے پائی تھیں کہ یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو سرکاری اعزازات کی جو فہرست اخباروں میں چھپی اُس میں اقبال کا نام بھی تھا۔

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اقبال کی عزّت افزائی کرنے کے لیے وقت کا انتخاب کرنے میں حکومت نے بڑی ستم ظریفی سے کام لیا تھا۔ اقبال ہی کے قریبی حلقے سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب کا بیان ہے کہ جن دنوں میں اقبال کو "سر" کا خطاب ملا، پنجاب کی سیاسی فضا سخت مکدّر تھی، ترکِ موالات کی تحریک کا زمانہ تھا، سودیشی کی تحریک زوروں پر تھی، انگریزی مال کے بائیکاٹ

کے ساتھ لوگ سرکاری ملازمتوں اور خطابات کا بائیکاٹ بھی فرض عین سمجھتے تھے۔[1]"

اقبال کے ایک دوسرے معتقد نے لکھا ہے:

"تحریک ترک موالات کی وجہ سے عوام میں سرکاری خطابات کے خلاف ایک گونہ نفرت پیدا ہو چکی تھی، اس لیے مسلمان علامہ جیسی محبوب شخصیت کا خطاب یافتہ ہونا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں[2]...."

ان اقتباسات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کے خطاب یافتہ بننے سے ان کی شہرت و مقبولیت کو شدید دھکا لگا تھا۔ ان سے پہلے ہی خطاب ان کے دوست میاں محمد شفیع کو مل چکا تھا جن کا وفاداران حکومت میں شمار ہوتا تھا اور جن کی برطانیہ پرستی ڈھکی چھپی نہیں تھی چنانچہ میاں محمد شفیع کے سَر بن جانے پر نہ تو کسی کو استعجاب ہوا اور نہ کسی نے ان کو مطعون ہی کیا۔ لیکن اقبال کا معاملہ بالکل مختلف تھا۔ عبدالمجید سالک نے "زمیندار" میں لکھا:

"میاں محمد شفیع کو 'سر' کا خطاب ملا تو کسی قومی اخبار نے ایک لفظ نہ لکھا۔ لیکن حضرت علامہ کے 'سر' بن جانے پر تمام دنیائے ادب و سیاست میں تہلکہ مچ گیا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ ظاہر ہے کہ میاں محمد شفیع کو قوم اپنا نہیں سمجھتی، وہ نہ تو پہلے کبھی قوم کی رائے کی پروا کرتے تھے، نہ اب کرتے ہیں۔ ان کا دائرہ عمل ہی دوسرا ہے۔ لیکن اقبال، ہمارا اقبال، قوم کی آنکھ کا تارا اقبال اگر ہم سے چھن جائے اور حکومت ایک دو[2] حرفی لفظ دکھا کر موہ لے تو یقیناً ماتم کا مقام ہے:

"توہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
"ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی تھا"[۳]

اس اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے، حکومت کا مقصد بھی یہی تھا۔ اقبال کو اس اعزاز سے نوازنے کے لیے حکومت نے جو وقت چُنا تھا، اس سے گمان ہوتا تھا کہ حکومت اقبال اور ہندستانی عوام کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جانا چاہتی تھی۔ اعزاز کی فہرست کی اشاعت سے دو ہی مہینے "پہلے" ترکی کی قومی اسمبلی نے یکم نومبر ۱۹۲۲ء کو خلافت کے خاتمے کا فیصلہ کر کے تحریک خلافت کو انتہائی مضحکہ خیز صورتِ حال سے دوچار کر دیا تھا۔[۴]"

اقبال کے نائٹ ہڈ کے اعزاز کی شانِ نزول ان کے مختلف دوستوں اور عقیدت مندوں نے، اقبال ہی کی زبانی سُنی ہوئی، قلم بند کی ہے۔ ان تمام بیانات میں مواد ایک ہی ہے۔ صرف اندازِ بیان کا جزوی اختلاف ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ سب سے پہلے جسٹس سر شادی لال نے اقبال سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ 'خان صاحب' کے خطاب کے لیے وہ ان کے نام کی سفارش کرنا چاہتے ہیں۔ اس تجویز کو اقبال نے ناگواری کے ساتھ ٹھکرا دیا۔

"اس زمانے میں سر ایڈورڈ میکیگن پنجاب کے گورنر تھے۔ ان سے علامہ کے عزیز دوست نواب ذوالفقار علی خاں کے گہرے روابط تھے۔ ایک دن نواب صاحب نے گورنر سے کہا کہ مشہور بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کو 'سر' کا خطاب مل چکا ہے، تعجب ہے کہ اقبال اس قدر دانی سے محروم ہیں، حالانکہ وہ بہت بڑے شاعر بھی ہیں اور مسلمانوں کے محبوب رہنما بھی۔ اس پر گورنر نے کہا کہ ہم انھیں 'خان بہادر' کا خطاب دلوائیں گے۔ نواب صاحب نے کہا کہ یہ خطاب تو اُن کے شایانِ نہیں ہے۔ گورنر بولے پھر 'شمس العلماء' کا خطاب کیسا رہے گا، نواب

صاحب نے کہا کہ یہ بھی مناسب نہیں۔ گویا اس طرح کہہ دیا کہ ملے تو 'سر' کا خطاب ملے، جو سب سے اونچا ہے۔[5]"

مندرجہ بالا روایت خورشید عبدالسلام نے ملفوظاتی انداز میں اپنے والد عبدالمجید سالک کی کتاب 'ذکرِ اقبال' کے حوالے سے اپنے الفاظ میں بیان کی ہے ان کے اندازِ بیان نے اس حادثہ کی ہول ناکی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس بیان کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ خطاب اقبال ہی کی خواہش کے مطابق اُنھیں ملا تھا۔ کیوں کہ نواب ذوالفقار علی خاں اقبال کی مرضی بلکہ ایما کے بغیر گورنر سے ان کے نام کی تحریک نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ گورنر پنجاب یا صوبے کے اعلا سرکاری حلقے اقبال کی مقبولیت سے بے خبر رہے ہوں۔

بات بہت صاف ہے۔ حکومت اپنے مصالح کی بنا پر اقبال کو کوئی خطاب دینا چاہتی تھی۔ اس نے پہلے سر شادی لال کو بیچ میں ڈالا۔ اُنھیں کامیابی نہ ہوئی تو اقبال کے دوست نواب ذوالفقار علی کی معرفت کوشش کی۔ گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان ہی ذوالفقار علی نے اقبال کو وار کونسل اور جشنِ صلح کے جلسوں میں حصہ لینے اور نظمیں پڑھنے پر مجبور کیا تھا۔ سر شادی لال نے 'خان صاحبی' سے معاملہ شروع کیا تھا۔ اقبال کے انکار کے چند روز بعد اُنھوں نے اقبال کو پھر بُلایا، لیکن وہ گئے 'نہیں'۔ اس کے بعد گورنر نے نواب ذوالفقار علی خاں کو بیچ میں ڈالا اور 'خان بہادری' کی پیش کش کی، پھر 'شمس العلماء' کی تجویز پیش کی۔ بالآخر نائٹ ہڈ پر معاملہ طے ہو گیا۔ اس کے بعد گورنر نے اقبال کو بلا کر کہا:

"مجھے انتہائی افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے تمھاری ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں اب تک تساہلی روا رکھی ہے۔ میں اس وقت خطابات

کی سفارش کر رہا ہوں، اور میری خواہش ہے کہ نائٹ ہڈ کے لیے تمھاری سفارش کی جائے۔"

اس کی منظوری دیتے ہوئے اقبال نے کہا:

"اسلام سماجی امتیازات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ لیکن میرا انکار اگر گورنمنٹ کے جذبات کو مجروح کرنے کا باعث ہو، تو مجھے تامل نہیں"۔

اقبال کے اس جواب کو سُن کر

"میکیگن کے چہرے پر مسرت جھلکنے لگی[۶]"۔

اس آخری جملے سے رسالہ 'زمانہ' (کان پور) کے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ:

قومیت پر آ گئی غالب حکومت کی ادا
پہلے تھے علامہ اقبال اب 'سر' ہو گئے

یہ خیال اڈیٹر زمانہ کے ایک دوست ہی تک محدود نہیں تھا، جنھوں نے "خوشی میں یہ شعر کہا" تھا۔ اقبال کے انتہائی قریبی دوست بھی اسی نوع کے اندیشہ ہائے دور و دراز میں گرفتار تھے۔ سب سے شدید ردِ عمل سالک پر ہوا، جو اقبال کے ساتھ گہری عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "راقم الحروف نے بھی جو اس سے دو ماہ قبل ترکِ موالات میں سال بھر کی قید کاٹ کر واپس آیا تھا، 'زمیندار' میں چند اشعار شائع کیے اور ایک دو کالم افکار و حوادث کے بھی لکھ دیے۔ وہ اشعار زبان زدِ خاص و عام ہو گئے[۸]"۔ لیکن یہ اشعار نہ تو سالک نے ذکرِ اقبال میں نقل کیے اور نہ خورشید عبدالسلام نے 'سرگذشتِ اقبال' میں۔ لیکن موخرالذکر نے اپنے ایک مضمون میں وہ اشعار نقل کر دیے ہیں[۹]، جو یہ ہیں:

لو مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت — افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو مسلمانوں کے سر ہوتے تھے اکثر — تنگ آ کے اب انگریزوں کے سر ہو گئے اقبال

پہلے تو سر ملّت بیضا کے تھے وہ تاج
اب اور سنو تاج کے سر ہو گئے اقبال

کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ
سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

کیا کہنے ہیں اس شیوۂ تسلیم و رضا کے
سرکار ہوئی تیغ تو سر ہو گئے اقبال

سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا
سرکار کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال

سودائے غمِ عشق سے سالک تو ہوا قید
اور خوبیِ تقدیر سے سر ہو گئے اقبال

اقبال کے نائٹ ہڈ کے سلسلے میں ایک دوسرا نقطۂ نگاہ بھی ہے ۔ مثلاً بشیر احمد ڈار نے لکھا ہے ۔

"ہندستان کی سیاسی زندگی میں اقبال کا کردار بڑا انقلابی ہے ۔ "سر" کا خطاب ملنے پر اپنوں اور غیروں نے ان کو تضحیک کا نشانہ بنایا لیکن وہ اس سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کے علمبردار رہے ۔ اگر کبھی وہ ان لوگوں کا ساتھ دیتے تھے جو صریحاً انگریزوں کے وفادار تھے تو یہ اشتراک انگریزوں کے مفاد کی نگہبانی کے لیے نہ تھا ، بلکہ مقصود مسلمانوں کا مفاد ہی تھا ۔ اگر آپ نے [اقبال نے] ان لوگوں کے خلاف جد و جہد کی ، جو بہ ظاہر انگریزی اقتدار کے خلاف تھے ، اس کا مقصد بھی ملّت کا عمومی مفاد تھا ۔" ۱۰

اقبال کے انتقال کے بعد یہی بات مولانا مودودی نے واضح تر الفاظ میں کہی تھی :

اقبال کے نائٹ ہڈ اور سر شفیع جیسے حضرات کے ساتھ تعاون کے سیاسی رشتے کو دیکھ کر عام خیال یہ تھا اور اب بھی ہے کہ وہ محض شاعری ہی میں آزاد خیال تھے ، عملی زندگی میں آزاد خیالی ان کو

چھو کر بھی نہیں گزری تھی، بلکہ وہ انگریز کے غلام تھے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے .... سیاست میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندستان میں 'دارالاسلام' کو اپنا مقصود حقیقی بنائے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو۔ صرف یہی وجہ تھی کہ اُنھوں نے عملی سیاست میں ان لوگوں کے ساتھ مجبورانہ تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیرِ سایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے۔ گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقے میں کوئی ربط نہ تھا، مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقے کے ساتھ جوڑے رکھا۔"

اقبال کے نائٹ ہُڈ کے سلسلے میں بشیر احمد ڈار نے جو توضیح کی ہے، وہ ایک مخصوص مدرسۂ فکر اور مخصوص ذہن کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کے استدلال کو صرف کٹھ حجتی ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی صحیح الفکر ذہن یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ اقبال کے خطاب یافتہ ہونے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ پہنچا ہو، یا ان کے وقار میں اضافہ ہوا ہو۔ انگریزوں کے وفاداروں کے ساتھ اقبال کے اشتراک و تعاون کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔

مولانا مودودی کے طرزِ استدلال کے بارے میں جتنا کم کہا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ اُنھوں نے اقبال کے منہ میں اپنی زبان رکھنے کی کوشش کی ہے 'دارالکفر' اور 'دارالاسلام' کی جو بے محل اصطلاحیں ہندستان کے لیے استعمال کی ہیں، اقبال اُنھیں یقیناً پسند نہ کرتے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ اقبال ہی کے ایما سے مولانا مودودی نے دکن کی سرزمین

خیر باد کہا تھا، اور اقبال کی وفات سے چند ہی ماہ قبل پٹھان کوٹ میں اقامت اختیار کی تھی، جو اس وقت پنجاب میں تھا۔ یہیں اُنھوں نے جماعت اسلامی کو منظم کیا لیکن پنجاب آنے کے بعد جماعت اسلامی کی سیاست کو جس نہج پر اُنھوں نے چلایا، اقبال شاید اُس سے اتفاق نہ کرتے۔

حوالے

۱۔ روزگار فقیر: وحید الدین: ص ۴۰

۲۔ ذکر اقبال: عبد المجید سالک: ص ۱۱۶

۳۔ بہ حوالہ خورشید عبد السلام: نقوش (لاہور) اقبال نمبر ۲: دسمبر ۱۹۷۷: ص ۳۲-۵۳۱

۴۔ MUSLIM NATIONALISM IN INDIA AND PAKISTAN: Hafeez Malik, p.238

۵۔ سرگذشت اقبال: خورشید عبد السلام: ص: ۱۶۲

۶۔ روزگار فقیر: ص ۴-۴۰

۷۔ زمانہ (کانپور)، جنوری ۱۹۲۳: ص ۶۹: بہ حوالہ اوراق گم گشتہ: مرتبہ رحیم بخش شاہین: ص ۴۳۰

۸۔ ذکر اقبال: ص ۱۱۷

۹۔ نقوش اقبال نمبر ۲: دسمبر ۱۹۷۷ء: ص ۲-۳۱

۱۰۔ سفر نامۂ اقبال: مرتبہ حمزہ فاروقی: مقدمہ بشیر احمد ڈار: ص ۶

۱۱۔ حیات اقبال کا سبق: ابو الاعلیٰ مودودی: رسالہ جوہر (جامعہ ملیہ اسلامیہ) اقبال نمبر ۱۹۳۸: ص ۴۰

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو

اقبال کے نام کے ساتھ "مسلم سوشلسٹ" کی صفت کا اضافہ آج سے چالیس سال قبل ۱۹۳۸ء میں، پروفیسر محمد دین تاثیر نے کیا تھا۔ لیکن اقبال کو اشتراکی اور بالشوک کہنے کی روایت تو نصف صدی سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ 'خطوطِ اقبال' میں رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کا ایک مراسلہ نقل کیا ہے، جو لاہور کے ایک کمیونسٹ اخبار روزنامہ 'زمیندار' کی اشاعت مورخہ ۲۴ جون ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ قصہ بانگِ درا کی پہلی اشاعت سے ایک سال پہلے کا تھا۔ اقبال نے اس مراسلے میں اشتراکیت سے اپنی لاتعلقی ہی کا نہیں بلکہ اپنے شدید تنفر کا بھی اظہار کیا تھا۔ ان کے اس اظہارِ خیال کا محرک ایک مضمون تھا جو متذکرہ بالا اخبار میں ان کے مراسلے کی اشاعت سے ایک ہی دن پہلے چھپا تھا۔ اس مضمون میں اقبال کو تہمتِ اشتراکیت سے غالباً پہلی بار متہم کیا گیا تھا۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"اشتراکیت کی حمایت کوئی جرم نہیں ہے . . . علامہ اقبال بھی بالشوک خیالات رکھتے ہیں۔ کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی 'خضرِ راہ' اور 'پیام مشرق' کو بغور دیکھے تو اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ بھی ہیں۔ 'پیام مشرق' میں 'قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور'، اور 'نوائے وقت' کے عنوان سے آ(انھوں نے) جو مختصر نظمیں لکھی ہیں . . . کیا ایسے اشعار کی موجودگی میں کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال

ایک انتہائی خیالات رکھنے والے اشتراکی نہیں ہیں؟"[۲]

اس مضمون کی شانِ نزول یہ تھی کہ ان دنوں لاہور میں بالشوک سازش کا ایک مقدمہ چل رہا تھا، اور ایک بزرگ پروفیسر غلام حسین بھی، اس مقدمے میں ماخوذ تھے۔ ان ہی کے دفاع میں یہ مضمون لکھا گیا تھا اور ان کی وکالت کرتے ہوئے اقبال کو کمیونسٹ ہی نہیں بلکہ کمیونزم کا مبلغ اعلیٰ بھی کہا گیا تھا۔ اقبال پر اس کا جو ردِعمل ہوا وہ حد درجہ شدید اور اسی درجہ دلچسپ بھی تھا۔ جس دن یہ مضمون چھپا اسی دن اقبال کے کسی دوست نے ان سے اس کا تذکرہ کیا تو اقبال کو اپنے پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی محسوس ہوئی، اور وہ اس درجہ متوحش اور متردد ہوئے کہ مضمون بلا دیکھے ہوئے اس کی تردید انھوں نے ضروری سمجھی۔ چنانچہ اسی وقت ایک تردیدی مراسلہ انھوں نے لکھا جو دوسرے دن کے اخبار میں شائع ہوا۔ اس مراسلے کے ابتدائی اور آخری حصے کے اقتباسات یہ ہیں

"میں نے ابھی ابھی ایک دوست سے سُنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں، یا کسی اور اخبار میں (میں نے ابھی اخبار نہیں دیکھا ہے) میری طرف بالشوک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بالشوک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے اس لیے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

"میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے، اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے، کہ انسانی جماعتوں کے اغراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے، تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں ہے کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے، جیسا کہ بالشوک تجویز کرتے ہیں۔۔۔

"... مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائیگی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے، یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ ... موجودہ حالات میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین کتنا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریقِ عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹکل اکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کو لازم ہے کہ قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے ...[۳]"

اس مراسلے کو "خطوطِ اقبال" میں تمام و کمال نقل کرنے کے بعد رفیع الدین ہاشمی کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال تو پیدا ہوا کہ بلا مضمون پڑھے ہوئے اقبال نے اسی روز اور اسی لمحے اڈیٹر زمیندار کو خط لکھ کر اس کی تردید (کیوں) ضروری سمجھی، اور تردید بھی اتنی مفصل[۴] لیکن اس کا جواب ڈھونڈنے کی اُنھوں نے ارادی یا غیر ارادی طور پر کوئی کوشش نہیں کی۔ عبدالسلام خورشید نے بھی اپنی ضخیم کتاب "سرگزشت اقبال" میں اس مراسلے کے طویل اقتباسات تو درج کیے، لیکن انھوں نے بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ ان دونوں حضرات کے گریز کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کے جواب سے اقبال کے فکر و عمل کی دورنگی ظاہر ہونے کا امکان تھا۔

اقبال نے اپنی زندگی کے دو خانے بنا رکھے تھے۔ ایک کا تعلق فکر سے تھا اور دوسرے کا عمل سے۔ فکر کی دنیا میں وہ جس درجہ آزاد تھے، عمل کی دنیا میں اُس سے شدید تر بندش بھی اُنھوں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی تھی، اور کوئی بھی ایسا اقدام کرنے پر وہ خود کو آمادہ نہیں کر سکتے تھے جس سے حکومت کی چشم ابرو پر شکن پڑنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہو۔

اپنی زندگی کے موخرالذکر خانے کو محفوظ رکھنے کے لیے اقبال نے ارادی طور پر کوشش کی کہ ان کے قارئین کا حلقہ وسیع نہ ہونے پائے۔ اسی کے پیش نظر انھوں نے اردو کی جگہ پر فارسی زبان کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ ۱۹۳۲ء میں لندن کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے اردو کی جگہ پر فارسی زبان کو اختیار کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تھا:

"اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنا شروع کرنے سے متعلق مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج میں یہ راز بھی بتا دوں کہ میں نے کیوں فارسی زبان میں شعر کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب یہ خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان میں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں... حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا... ہندستان میں فارسی جاننے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ میں جو خیالات باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں..."[5]

اقبال کی زندگی کے اول الذکر پہلو نے ان سے ایسی نظمیں کہلائیں، جن کی بنا پر اڈیٹر 'زمیندار' نے ان کو اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کا مبلغ اعلا گردانا، اور موخرالذکر پہلو نے اس دعوے کی فوری تردید پر انھیں مجبور کیا۔ یہ واقعہ جس زمانے میں پیش آیا وہ تھا بھی ہماری تاریخ کا انتہائی نازک دور۔ انقلاب روس سے قبل برطانوی سامراج کو ہندستان کی شمال مغربی سرحد پر زارِ روس کے گُم اٹم منڈلاتے نظر آتے تھے۔ انقلاب کے بعد اس کی جگہ بالشوزم کے ہوّے نے لے لی تھی۔ ۱۹۲۳ء میں اقبال کو جب علانیہ اشتراکی کہا گیا تھا، اس وقت ہندستان میں اشتراکی خیالات کے نشو و نما کا اور اشتراکی طرز کی مزدور یونینوں کے آغاز کا زمانہ تھا۔ دوسری طرف بین الاقوامی کمیونسٹ تنظیم نے ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کا کام برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے سپرد کیا تھا۔ حالات کی اس

روس کو حکومت انتہائی پر تشویش اور غضب ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دار و گیر کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ لاہور میں بھی بالشوک سازش کا ایک مقدمہ زیر سماعت تھا۔ ان حالات میں سراسیمہ ہو کر اقبال کا اشتراکیت سے اپنی برائت ہی کا نہیں بلکہ اس سے شدید اختلاف کا اظہار کرنا ان کی افتاد طبع کے عین مطابق تھا۔ حکومت کو بھی اقبال کے اشتراکی ہونے کا اور اشتراکیت کے مبلغ ہونے کا اگر یقین ہو جاتا تو ان کی زندگی کے اس پہلو پر سرے سے پانی پھر سکتا تھا، جس کی تعمیر میں اُنھوں نے اپنی عوامی مقبولیت کو بھی داؤں پر لگا دیا تھا، اور ان کی وہ نائٹ ہڈ بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی، جس کے حصول پر ابھی چھ مہینے بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔

دوسری طرف اقبال کے دل و دماغ کو روس کے اس انقلاب نے بے طرح متاثر بھی کیا تھا، جو بیسویں صدی ہی کا نہیں، انسانی تاریخ کا بھی اہم ترین واقعہ تھا۔ اس نے روس کی وسیع سلطنت میں جو دنیا کے پانچویں حصے پر پھیلی تھی، زار شاہی کا خاتمہ کر کے پہلی بار محنت کشوں کی حکومت قائم کی تھی، اور اس کے اثرات روس ہی تک محدود نہیں رہے تھے، بلکہ پہلی جنگ عظیم کی فاتح طاقتیں۔ برطانیہ اور امریکا۔ بھی اس سے لرز اٹھی تھیں۔ اس انقلاب نے مشرق کے ملکوں خصوصاً ہندستان کی جدوجہد آزادی کو نیا حوصلہ بخشا تھا اور اس کی رفتار تیز تر کر دی تھی۔ اقبال کی فکر نے بھی اس انقلاب کو "بطن گیتی سے آفتاب تازہ" کے ظہور سے تعبیر کیا تھا، اور اسے خوش آمدید کہنے میں بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ اقبال ہی ہمارے ملک کے پہلے شاعر تھے جنھوں نے انقلاب روس کو اپنی فکر کا موضوع بنایا اور پر جوش انداز میں انقلاب کے نغمے گائے۔ "پیام مشرق"، (۱۹۲۳ء) کی اکثر اور 'بانگ درا'، (۱۹۲۴ء) کے آخری حصے کی بیشتر نظموں میں اقبال نے، بلا اگر مگر کے، جن انقلابی خیالات کا اظہار کیا تھا، ان سے یہ گمان ہونا

غلط نہیں تھا کہ "علامہ اقبال بھی بالشویک خیالات رکھتے ہیں ..." اقبال کی طویل اور کامیاب ترین نظم 'خضرِ راہ'، اسی دور کی یادگار ہے، جس میں شاعر نے خضرِ راہ سے ایک یہ سوال بھی کیا تھا:

اور سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اس کے جواب میں خضر نے جن خیالات کا اظہار کیا، انھیں سیدھے سادے الفاظ میں اشتراکی تعلیمات کا نچوڑ کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس کا پہلا بند یہ ہے:

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
ساحر الموت نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات
نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات
کٹ مرا ناداں خیالی دیوتاؤں کے لیے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقدِ حیات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بانگِ درا کی اشاعت سے ایک سال قبل، ۱۹۲۳ء کے وسط میں اقبال کا فارسی مجموعۂ کلام 'پیامِ مشرق' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے لکھا تھا کہ

"یورپ کی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے، اور اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔"[۶]

مندرجہ بالا اقتباس میں اقبال نے جس نئے آدم کے ظہور کا مژدہ سنایا تھا

اس نے سوویت یونین میں جنم لیا تھا۔ پیام مشرق کی تمام نظموں میں، خواہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی، جو نیا ولولہ اور نیا آہنگ ملتا ہے، وہ انقلاب روس ہی کی دین تھا۔ خضر راہ ۱۹۲۱ء میں لکھی گئی تھی۔ 'پیام مشرق' کی بیشتر نظمیں بھی اسی زمانے کی ہیں اور ان میں سے اکثر نظموں میں اقبال نے ان خیالات کو واضح تر الفاظ میں بیان کیا ہے، جو ہمیں 'خضر راہ' میں ملتے ہیں۔ مثال کے لیے یہ شعر لیجیے۔

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

اس کی مکمل تفسیر 'قسمت نامہ سرمایہ دار و مزدور' میں ملتی ہے۔ سرمایہ دار بڑی پُرکاری سے مزدور کو سمجھاتا ہے کہ یہ پُرشور کارخانے، مال و منال اور دنیوی عیش و آرام جو عارضی ہیں اور جن کے حصول میں بڑی دردسری کرنی پڑتی ہے، وہ میں لیے لیتا ہوں اور دوسری دنیا کا ابدی عیش و آرام تمھارے لیے چھوڑتا ہوں۔ زمین کے اندر جو کچھ ہے وہ میرا ہے اور زمین سے لے کر عرش معلّا تک جو کچھ ہے اس کے مالک تم ہو:

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من — گلبانگ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج بر و می نہد ز من — باغِ بہشت و سدرہ و طوبا از آنِ تو
تلخابۂ کہ دردِ سر آرد از آنِ من — صہبائے پاکِ آدم و حوّا از آنِ تو
مرغابی و تدرو و کبوتر از آنِ من — ظلِ ہما و شہپرِ عنقا از آنِ تو

ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّا از آنِ تو

'پیام مشرق' ہی کے مندرجہ ذیل اشعار میں اقبال نے انقلاب روس کی پوری داستان بیان کی ہے۔ زارشاہی کے خاتمے کے ساتھ ہی شہنشاہیت کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے۔ دنیا کے محنت کش اپنی حکمرانی قائم کرنے کے لیے میدانِ کارزار میں اُتر آئے

ہیں۔ روس میں لینن کو جلاوطنی سے آزاد کر کے سربراہِ مملکت بنا دیا گیا ہے۔ جو باتیں پردۂ راز میں تھیں، معلوم عوام ہو چکی ہیں اور اب باتیں بنانے سے کام نہیں چل سکتا ہے۔ اس کے بعد اپنے ہم وطنوں کو اقبال متنبہ کرتے ہیں کہ زندگی ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے اگر تم نے بصیرت سے کام نہ لیا تو اس دوڑ میں تم پیچھے رہ جاؤ گے:۔

افسرِ پادشاہی رفت و بہ یغمائی رفت
نے اسکندری و نغمۂ دارائی رفت

کوہ کن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

یوسفی راز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت

رازہائے کہ نہاں بود، بہ بازار افتاد
آں سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت

چشم بکشای اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پے تعمیرِ جہانِ دگر است

اسی مجموعے کی ایک نظم نوائے مزدور ہے، جس میں مزدور کا یہ احساس پوری شدت سے کارفرما نظر آتا ہے کہ موٹا جھوٹا پہننے والے اور نیم فاقہ زدہ مزدوروں ہی کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے حرام خور کارخانہ داروں کو ریشمی کپڑے اور زروجواہر نصیب ہوتے ہیں اہلِ کلیسا بھی ہمارے ہی خون سے جونک کی طرح پلتے ہیں اور کاروبار سلطنت بھی ہمارے زورِ بازو سے چلتا ہے اور اس خرابۂ عالم کی ساری رونق ہماری ہی بدولت ہے:

زمزدِ بندہ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر

زخوی فشانیِ من لعلِ خاتمِ والی
ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیر

زخونِ من چو زلو فربہیِ کلیسا را
بزورِ بازوے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستان ز گریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم

اسی نظم کے دوسرے بند میں قدیم نظام کو درہم برہم کرنے اور غارتگرانِ عالم سے

انتقام لینے کی محنت کشوں کو دعوت دی گئی ہے:

بیا کہ تازہ نوائی تراود از رگِ ساز ۔۔۔ مے کہ شیشہ گدازد بساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم ۔۔۔ بنائے میکدہ ہای کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقام لالہ کشیم ۔۔۔ بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے
زخویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اس دور میں اقبال کے ذہن پر انقلاب کا تصور جس طرح چھایا ہوا تھا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک نے جب 'محنت و سرمایہ' کی آویزش ہی کی بنا پر ظفر علی خاں کے اخبار 'زمیندار' سے علاحدگی اختیار کی اور ایک نئے اخبار کی طرح ڈالی تو اقبال نے اس نئے اخبار کا نام 'انقلاب' تجویز کیا اور اس کے پہلے شمارے کے لیے 'خواجہ و مزدور' کے عنوان سے ایک نظم بھی کہہ کر دی۔ جس میں سرمایہ داری اور جاگیرداری ہی کے خلاف نہیں، بلکہ مذہب کے ٹھیکیداروں کے خلاف بھی احتجاج کیا گیا تھا:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب ۔۔۔ از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب! اے انقلاب

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام ۔۔۔ کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب

انقلاب

انقلاب! اے انقلاب

یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ انقلاب روس سے پندرہ سال قبل اقبال نے اپنی اوّلین تصنیف علم الاقتصاد میں ملکیت کے باب میں جن خیالات کا اظہار

کیا تھا، ان میں بھی کارل مارکس کے افکار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی تھی۔ مثلاً ایک جگہ اُنھوں نے لکھا ہے:

"تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں ملکیت یا جائیداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسبِ ضرورت سب کا حصہ تھا۔ ہر شے ہر شخص کی ملکیت تھی، اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی (؟) نہیں ہے، نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی، نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسانی مل کر گزارا کرتے تھے اور امن و صلح کاری (کذا) کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہاتوں میں اس وقت بھی کسی نہ کسی شکل میں مروج ہے۔ زمانۂ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلا اور افضل ہے۔

"جائدادِ شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ لہٰذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بیجا امتیازات کو یک قلم موقوف کرکے قدیمی و قدرتی اصول مشارکت فی الاشیا کو مروج کیا جائے اور کچھ نہیں تو ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے۔ کیوں کہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے، جس میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔ حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز رہی ہے۔ لیکن اس کا مفصل ذکر ہم اس ابتدائی کتاب میں نہیں دینا چاہتے...۹"

علم الاقتصاد میں جو بات اقبال نے کہی تھی، وہی اُنھوں نے تیس سال بعد

بال جبریل کے اس شعر میں بھی دہرائی:

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ۱۹۰۳ء میں جب اقبال نے علم الاقتصاد لکھی تھی تو اس وقت ان کا ذہن سوشلزم کے اس تصور کو قبول کر چکا تھا جو انیسویں صدی کے وسط میں کارل مارکس نے ایک مکمل فلسفے کی شکل میں پیش کیا تھا۔ روس میں مارکس کے فلسفے کی کامیابی نے اقبال کے سوشلسٹ رجحان کو پختہ کر دیا۔ لیکن مارکسیت میں خدا کے وجود سے انکار کا اور مذہب سے تنفر کا ایک پہلو بھی مضمر تھا، جو اقبال کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر اس جزوی اختلاف کے باوجود سوشلسٹ خیالات کی ترویج و اشاعت بھی وہ کرتے رہے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سوشلزم کے داعیوں کی طرح اقبال کو بھی سرمایہ داری اور سامراج سے شدید نفرت تھی۔ وہ ان دونوں کو انسانیت کے لیے لعنت اور اسلام کی تعلیمات کے منافی سمجھتے تھے۔ یہی جذبہ انھیں سوشلزم سے قریب لاتا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ سوویٹ نظام میں اگر خدا کے وجود کا اقرار بھی داخل ہو جائے تو وہ عین اسلام ہو گا۔ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں اقبال یہ سمجھتے تھے کہ "زاویۂ نگاہ کی ذرا سی تبدیلی سے اشتراکیت اسلام بن سکتی ہے یا اسلام اشتراکیت ہو سکتا ہے۔"[9]

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ کارل مارکس کی مذہب دشمنی کے باوجود اقبال نے کارل مارکس اور اس کی تصنیف 'سرمایہ' (CAPITAL) کا ہر جگہ محبت و عقیدت سے نام لیا ہے۔ ان کے نزدیک مارکس پیغمبر نہ ہونے کے باوجود صاحبِ کتاب تھا:

"نیست پیغمبر، ولیکن در بغل دارد کتاب"

یہی بات اقبال نے 'جاوید نامہ' میں واضح تر الفاظ میں کہی تھی اور 'سرمایہ' کے مصنف 'پیغمبرِ بے جبرئیل' کا رشتہ ابراہیم خلیل اللہ سے جوڑا تھا۔ ان کے نزدیک کارل

مارکس کا اندازِ فکر تو کافرانہ تھا، لیکن اس کا قلب مومن تھا، اور اس کے باطل خیالات بھی حق پر مبنی ہیں۔ اس میں خرابی بس یہ ہے کہ اس کا فلسفۂ زندگی روحانیت سے تہی ہے اور اس کا سارا زور اس پر ہے کہ روٹی سب کو برابر ملے:

صاحبِ سرمایہ، از نسلِ خلیل ٭ یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است ٭ قلبِ او مومن دماغش کافر است
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک ٭ جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آن پیغمبرِ حق ناشناس ٭ بر مساواتِ شکم دارد اساس

اس برصغیر ہند میں سوشلزم کی ترویج و اشاعت سے متعلق جو تاریخیں اب تک لکھی گئی ہیں، وہ اگرچہ اقبال کے ذکر سے خالی ہیں، تاہم یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ سوشلزم کے تصور کے پرچار کی خدمت اقبال نے بالواسطہ اور براہِ راست بھی، اس وقت انجام دی تھی جب نہ تو ہمارے ملک کے رہنماؤں میں سے کسی کو باستثنائے حسرت موہانی، اپنے کو کمیونسٹ یا سوشلسٹ کہنے کی ہمت ہوئی تھی اور نہ کسی پارٹی کے نصب العین میں سوشلزم کو جگہ ملی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا، لیکن وہ غیر قانونی تھی اور اس کے بیشتر کارکن تا قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے۔ اقبال نے ۱۹۳۱ء میں اسلام اور بالشوزم کے باہمی ربط سے متعلق ایک خط میں دو ٹوک انداز میں لکھا تھا کہ:

"بالشوزم میں خدا کا تصور اگر داخل کر دیا جائے، تو وہ بڑی حد تک اسلام کے مماثل ہو جائے گا۔ مجھے حیرت نہ ہوگی اگر آگے چل کر اسلام روس پر یا روس اسلام پر چھا جائے۔"

لاہور کے اخبار، روزنامہ سیول اینڈ ملٹری گزٹ، کی ۳۰ جولائی ۱۹۳۱ء کی اشاعت میں یہ خط شائع ہو گیا تھا۔ اس کے چھ مہینے بعد ایک اخبار نویس نے اقبال سے ان کے اس خیال کی وضاحت چاہی تو انھوں نے کہا:

"اسلام سوشلسٹ طرز کا مذہب ہے۔ مطلق سوشلزم اور نجی ملکیت کے باب میں قرآن نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔۔۔

"میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ آپ جسے بالشوزم اور سامراج کہتے ہیں عصر حاضر ان دونوں میں بنیادی تبدیلیاں لائے گا۔ علاقائی سلطنتوں کے دن لد چکے ہیں۔ بالشوزم میں بھی، مطلق سوشلزم کے معنوں میں، ترمیمیں کی جانے لگی ہیں۔ ممکن ہے کہ معاشی نقطۂ نگاہ کے اختلاف کی بنا پر روس اور برطانیہ برسرِ پیکار ہو جائیں۔ اس حالت میں صحیح فکر رکھنے والوں کی ہمدردیاں حق و صداقت کے ساتھ ہوں گی۔۔۔!"

۱۹۲۹ء میں اقبال نے روزنامہ زمیندار میں شائع ہونے والے تردیدی مراسلے میں بالشوک خیالات رکھنے والوں کو قطعیت کے ساتھ خارج از اسلام قرار دیا تھا، لیکن مندرجہ بالا بیان میں اُنھوں نے اسلام کو سوشلسٹ طرز کا مذہب کہا۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر اُنھوں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ معاشی نقطۂ نگاہ کے اختلاف کی بنا پر روس اور برطانیہ برسرِ پیکار ہوئے تو ان کی ہمدردی روس کے ساتھ ہوگی۔

یہ دو ٹوک بیان دینے کی ہمت اقبال کو اس وجہ سے ہوئی تھی کہ اُس وقت برطانوی سامراج کی گرفت ہندستان پر ڈھیلی پڑ چکی تھی اور روز بروز کمزور تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ اسی صورتِ حال کا کرشمہ تھا کہ ۱۹۳۴ء میں اقبال کی یہ علانیہ خواہش تھی کہ ملک میں سوشلسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہندستان میں پہلی سوشلسٹ کانفرنس ۷ مئی ۱۹۳۴ء کو اچاریہ نرندر دیو کی صدارت میں، پٹنہ میں، منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ پارٹی کی ہیئت کا تھا۔ یعنی اس کی شکل باضابطہ جداگانہ پارٹی کی ہو، یا کانگریس کے اندر رہ کر اس کے بازو کی طرح کام کرے۔ کانفرنس میں اس سوال

پر ووٹ لیے گئے تو جداگانہ پارٹی کے قیام کے حق میں ۲۲ ووٹ آئے اور اس کی مخالفت میں ۵۸ ووٹ آئے۔[12] اقبال اس کانفرنس میں شریک تو نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ سوشلسٹ پارٹی کا ایک جداگانہ وجود ہو اور کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اس لیے اس فیصلے سے انھیں دُکھ ہوا، لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک طویل بیان بھی جاری کیا، جس میں اور باتوں کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ:

"سوشلسٹ پارٹی کو اگرچہ شکست ہوئی ہے، لیکن اس کے سامنے مستقبل ہے۔ گو اس کا انحصار زیادہ تر کانگریس سے علاحدگی پر ہے۔"[13]

اسی بیان کے ابتدائی حصے میں اقبال نے ملک کی سیاسی صورتِ حال کا جو تجزیہ کیا تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملکی سیاست کی رفتار کا وہ گہرا مطالعہ کر رہے تھے اور ترقی پسند قومی سیاست کے دھاروں کے ساتھ زیر و زبر ہونے کے لیے وہ تیار تھے:

"امیروں کے خلاف ملک میں ایک عام جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ نازک مرحلوں پر امیر طبقہ ہمیشہ اُن سے غدّاری کرتا ہے۔ جو حکومتیں کبھی سرمایہ داری کی پوجا کرتی تھیں، آج مزدوروں اور کسانوں کے رحم و کرم پر جی رہی ہیں۔ سب طرف بے چینی کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت ایسی خطرناک صورت اختیار کر لیں گی کہ ایک زبردست آگ بن کر دنیا کے موجودہ نظام کو بھسم کر دیں۔

"جب ساری دنیا میں مساوات کی لہر چل رہی ہے تو ہندستان کب اس کے اثر سے خالی رہ سکتا ہے۔ یہاں کے غریبوں میں اب بیداری پیدا ہو رہی ہے۔ اس وقت تک حکومت اور ہمارے

لیڈر اُن کی طرف سے بے پروا رہے ہیں، لیکن یہ حالت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ سوسائٹی ایک خطرناک دور سے گزر رہی ہے اور سوشلسٹ خیالات محض روسی پروپیگنڈے ہی کی وجہ سے نہیں پھیل رہے ہیں بلکہ اور بہت سے اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ملک کی اقتصادی حالت میں تبدیلی کا ہونا لازمی ہے۔[۱۴]"

ہندستان میں سوشلسٹ پارٹی کے قیام سے اقبال کو اتنی شدید دلچسپی کیوں تھی اور یہ بیان جاری کرنے کی ضرورت اُنھوں نے کیوں محسوس کی ؟ ان سوالوں کا اگرچہ کوئی واضح جواب ہمارے پاس نہیں ہے، لیکن ان کے بیان کے لب و لہجے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا یقیناً غلط نہ ہوگا کہ ملک میں باضابطہ سوشلسٹ پارٹی کا قیام اگر عمل میں آجاتا اور کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو اقبال اس پارٹی میں اگر شامل نہ بھی ہوتے تو بھی ان کی تمام تر ہمدردیاں اس کے ساتھ ضرور ہوتیں۔

سوشلزم کے تصور کو اقبال نے جس حد تک قبول کر لیا تھا۔ اس کا اندازہ بال جبریل سے بھی ہوتا ہے، جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس مجموعے کی تین نظمیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، جو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لینن (خدا کے حضور میں) فرشتوں کا گیت اور فرمانِ خدا (فرشتوں کو) پہلی نظم میں لینن کو بھی مرنے کے بعد خدا کی ذات کے زندہ و پائندہ ہونے پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے:

آج آنکھ نے دیکھا، تو وہ عالم ہوا ثابت — میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

اس کے بعد لینن خدا سے سوال کرتا ہے اور یہی سوال پوری نظم کی جان ہے:

اک بات، اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود

وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات؟
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری، منتظرِ روزِ مکافات

اس کے بعد فرشتے جو گیت گاتے ہیں، اس سے بھی لینن کی فریاد کی تائید ہوتی ہے:

عقل ہے بے زمام ابھی، عشق ہے بے مقام ابھی
نقش گرِ ازل! ترا نقش ہے ناتمام ابھی
خلقِ خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر
تیرے جہاں میں ہے وہی گردشِ صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

لینن کی فریاد اور گیت سننے کے بعد فرشتوں کو حکم دیتا ہے:

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ!
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اقبال کی اس نظم پر خلیفہ عبدالحکیم نے بڑے پرجوش انداز میں تبصرہ کیا ہے
ان کا خیال تھا کہ یہ نظم

" ایسی ہیجان انگیز اور ولولہ انگیز ہے کہ اس کے جذبے کو برقرار رکھتے ہوئے اگر روسی زبان میں اس کا موثر ترجمہ ہو سکتا، اور وہ لینن کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ اسے بین الاقوامی اشتراکیت کا ترانہ بنا دینے پر آمادہ ہو جاتا۔ سوا اس کے کہ ملحد لینن کو اس میں یہ خلل نظر آتا کہ اس میں خدا یہ پیغام اپنے فرشتوں کو دے رہا ہے، اور اس کے نزدیک وجود نہ خدا کا ہے نہ فرشتوں کا ... یہ نظم کمیونسٹ مینی فیسٹو (اشتراکی لائحہ عمل) کا لب لباب ہے اور محنت کشوں کے لیے انقلاب بلکہ بغاوت کی تحریک ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت کے تمام معاشی پہلوؤں سے اتفاق رائے رکھتے تھے۔ سوا اس کے کہ اس تمام تنظیم جدید نے انسانوں کے دل و دماغ پر یہ غلط عقیدہ مسلط کر دیا ہے کہ تمام زندگی مادی اسباب کی عادلانہ یا مساوی تقسیم سے فروغ اور ترقی حاصل کر سکتی ہے۔

اقبال کو جس حد تک "اشتراکیت" سے اتفاق ہے۔ اُس حد تک افکار اور جذبات ایسے ہیں جو لینن اور کارل مارکس اور انگلز کی زبان سے بھی ہو بہو اسی طرح ادا ہو سکتے تھے۔ خدا فرشتوں کو جو حکم دے رہا ہے، وہی تقاضا ائمۂ اشتراکیت تمام محنت کشوں سے کرتے ہیں، لیکن ان کے یہاں انسان انسان کو اُبھار رہا ہے خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں ...[۱۵]"

اقبال کو کمیونسٹ تو یقیناً نہیں کہا جا سکتا، لیکن ان کے سوشلسٹ ہونے سے

انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ اقبال کا سوشلزم کا تصوّر اُسی قسم کا تھا، جو آج ہمارا ہے، جس میں پبلک سکٹر کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ سکٹر کا وجود بھی گوارا کیا جاتا ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ:

"اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا، ... بلکہ اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی بھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔"[۱۶]

اقبال نے اس عقیدے کا اظہار اُس مضمون کے جواب میں کیا تھا جس میں اُن پر بالشوک یا کمیونسٹ ہونے کی تہمت رکھی گئی تھی۔ اس کے دس سال بعد اُنھوں نے اپنے اسی عقیدے کا اعادہ ایک نجی خط میں بھی کیا، جو ۹ر مئی ۱۹۳۲ء کو لکھا گیا تھا۔

"اسلامی معاشیات کی روح یہ ہے کہ بڑی مقدار میں سرمایہ میں اضافے کو ناممکن بنا دیا جائے ... بالشوزم نے سرمایہ داری کا کلیتاً خاتمہ کر کے انتہائی اقدام کیا ہے۔ اسلام زندگی کے تمام پہلوؤں میں اعتدال کی راہ اختیار کرتا ہے۔"[۱۷]

جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے اقبال کے ذہن نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ اس ملک کی بیشتر آبادی جو مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل ہے، اس کے مسائل کی نوعیت وہی ہے جو انقلاب سے پہلے روس کی تھی۔ اسی احساس کے پیش نظر اُنھوں نے سوویٹ روس کے معاشی تجربے کا دلچسپی سے مطالعہ کیا تھا اور اس سے وہ متاثر بھی ہوئے تھے۔ محمد دین تاثیر کے بیان کے مطابق اقبال نے: "یہ بات متعدد بار واضح الفاظ میں کہی تھی کہ اگر مجھے کسی مسلم ملک کا سربراہ بنا دیا جائے تو وہ سب سے پہلے اسے سوشلسٹ ریاست بنائیں گے۔"[۱۸]

اقبال کی وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے جواہر لال نہرو ان سے ملے۔ ان کا بیان ہے کہ اقبال :

"زندگی کے آخری برسوں میں سوشلزم سے بہت قریب آگئے تھے سوویٹ یونین نے جو عظیم ترقی کی تھی، اس نے انھیں گرویدہ بنا لیا تھا۔[۱۹]"

یہی بات کانٹول اسمتھ نے دوسرے انداز میں لکھی ہے :

خدا کی منکر اور روحانیت سے تہی ہونے کے باوجود سوشلسٹ تحریک اور سوویٹ یونین سے اقبال کو ہمدردی تھی۔ اقبال کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے دوستوں نے اُنھیں یقین دلا دیا تھا کہ سوشلزم کو سمجھنے میں اُنھوں نے غلطی کی ہے۔ وہ اس کی تلافی کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔[۲۰]"

حوالے

۱۔ INTRODUCTION TO ASPECT OF IQBAL: M.D. Tasir, p.XIX

۲۔ روزنامہ زمیندار (لاہور) : ۲۳ جون ۱۹۲۳ء : بہ حوالہ خطوط اقبال۔ مرتبہ رفیع الدین ہاشمی : ص ۵۷۔۱۵۳

۳۔ ایضاً ۲۴ جون ۱۹۲۳ء

۴۔ خطوط اقبال : ص ۱۵۷

۵۔ سفرنامہ اقبال : مرتبہ حق نواز : ص ۱۱۳

۶۔ پیام مشرق : اقبال : دیباچہ : ص ک

۷۔ سالک مہر اور اقبال: خورشید عبدالسلام: نقوش اقبال نمبر ۲ دسمبر ۱۹۷۷ء

۸۔ علم الاقتصاد: شیخ محمد اقبال: ص ۵۱ - ۱۵۰

۹۔ فکر اقبال: خلیفہ عبدالحکیم: ص ۲۶۲

۱۰- SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL: Edited by Shamloo, p.164

۱۱- LETTERS AND WRITINGS OF IQBAL: Edited by Dar, p.57

۱۲- INDIAN ANNUAL REGISTER, 1934, Part I, p.242

۱۳۔ ہفت روزہ منادی (دہلی) یکم جون ۱۹۳۴ء: بہ حوالہ اوراق گم گشتہ: مرتبہ رحیم بخش شاہین: ۵ - ۴۴

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ فکر اقبال: ص ۵۹ - ۲۵۷

۱۶۔ خطوط اقبال: ص ۱۵۶

۱۷۔ ایضاً: ص ۲۲۸

۱۸- N.D.TASIR: Op.Cit., XIX

۱۹- DISCOVERY OF INDIA, Jawaharlal Nehru, p.509

۲۰- MODERN ISLAM IN INDIA: W.C.Smith, p.128

برلبِ او نالہ ہائے دردمند

افکارِ اقبال کے تنوع نے، جس کے ڈانڈے اکثر تضاد سے مل جاتے تھے ان کی سیاسی شخصیت کو بھی متنازع فیہ بنا دیا تھا، لیکن ان کا کوئی بھی ناقد اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ملک کو آزاد دیکھنے کی ان میں شدید تڑپ تھی اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وطن پرستی کا مخالف ہونے کے باوجود، مادرِ وطن سے ان کو گہری محبت و عقیدت تھی، جو زندگی کے آخری دور میں قوی تر ہو گئی تھی۔ خلیفہ عبدالحکیم کے الفاظ میں

"بعض لوگوں کا یہ خیال کہ آخری دور میں وطن کی محبت اقبال کے دل سے نکل گئی تھی، بالکل باطل ہے۔ ہندستان اور اس کے رہنے والوں کے ساتھ اس کا قلبی رشتہ آخر تک نہیں ٹوٹا۔ اقبال ہندستان کی زبوں حالی اور غلامی پر آخر تک آنسو بہاتا رہا..."

خلیفہ عبدالحکیم ہی نے اقبال کی شاعری کے ایک اہم اور دلچسپ پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے، جسے اقبال کو اسلامی شاعر کہنے والے یک سر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

"ہندستان کی روحانیت نے جو برگزیدہ انسان پیدا کیے ہیں اقبال نے ان پر نہایت خلوص، فراخ دلی اور وسیع المشربی سے نظمیں لکھی ہیں... باباگرونانک پر اقبال کی ایک مستقل نظم ہے، جو اس وقت کہی گئی تھی، جب وہ زیادہ تر اسلامی نظمیں لکھ رہے تھے

اس نظم کے پہلے شعر میں گوتم بدھ کو بھی پیغمبر قرار دیا ہے۔

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

"... بانگِ درا میں بڑے خلوص کے ساتھ شری رام چندر جی کی توصیف میں کچھ اشعار لکھے ہیں ... اقبال ان کو ہندستان کا امام یا پیغمبر تسلیم کرتے ہیں ...

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شامِ ہند[۲]

ہندستان کے ساتھ اقبال کے قلبی تعلق کا موثر ترین مظاہرہ ان کی طویل شاہکار نظم یا آسمانی سفر کی روداد 'جاوید نامہ' میں نظر آتا ہے، جو ان کی وفات سے پانچ یا ساڑھے پانچ سال قبل شائع ہوا تھا۔ اس کی اشاعت سے چند ماہ قبل لندن کی 'انڈیا سوسائٹی' کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے 'جاوید نامہ' کا تعارف انھوں نے ان الفاظ میں کرایا تھا:

"میری تازہ تصنیف جاوید نامہ مطبع میں جا چکی ہے ... یہ حقیقت میں ایشیا کی ڈیوائن کمیڈی ہے، جیسے ڈانٹے کی تصنیف یورپ کی ڈیوائن کمیڈی ہے ... ڈانٹے نے اپنا رفیقِ سفر ورجل کو بنایا تھا، میرے رفیقِ سفر، یا خضرِ طریقت، مولانائے روم ہیں ... چاند میں مشہور ہندو صوفی وشوامتر سے میری ملاقات ہوتی ہے، جس کا نام میں نے جاوید نامہ میں 'جہاں دوست' رکھا ہے، اس لیے کہ وشوامتر کے معنی جہاں دوست کے ہیں۔ وشوامتر

سے جو باتیں ہوئی ہیں، وہ ہیں نے "نہ تا سخن از عارف ہندی"
کے عنوان سے پیش کی ہیں ..."

جدید دور کے خلابازوں کی طرح اقبال نے بھی اپنے خلائی سفر کا آغاز "فلک قمر" سے کیا۔ یہ کم حیرت ناک نہیں ہے کہ اقبال کی چشم تصور نے چاند کی دنیا میں وہی مناظر دیکھے جو کم وبیش چالیس سال بعد چاند پر اُترنے والے پہلے انسان کی برہنہ آنکھوں کو نظر آئے ہیں۔ ہر طرف بھیانک سکوت، نہ آدم نہ آدم زاد، بے برگ و گیاہ ناہموار چٹانیں اور ہیبت ناک غار

آں سکوت، آں کوہسار ہولناک — اندروں پر سوز و بیروں چاک چاک
از درونش سبزۂ سر بر نزد — طائرے اندر فضائش پر نزد
ابرہا بے نم، ہوا تند و تیز — بازمینِ مردۂ اندر ستیز
نے بنا فتش ریشۂ نخلِ حیات — نے بہ صُلبِ روزگارش حادثات

گرچہ ہست از دودمانِ آفتاب
صبح و شامِ او نزاید انقلاب

آزادی کی تڑپ اور غلامی کے احساس سے قطع نظر، جاوید نامہ ہی سے ہم کو اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی دیومالائی روایات سے اور ہندوستان کے رشیوں اور منیوں سے بھی اقبال کو گہری عقیدت تھی۔

چنانچہ سب سے پہلے ان کی ملاقات عارف ہندی (وشوامترا) سے ہوتی ہے جو "یکے از غارہائے قمر خلوت گزیں ہے"۔ غار اتنا تاریک ہے کہ اس کے اندر قدم رکھتے ہوئے اقبال گھبرائے:

ماہ را از ظلمتش دل داغ داغ — اندرو خورشید محتاجِ چراغ
وہم و شک بر من شبیخوں ریختند — عقل و ہوشم را بدار آویختند

لیکن اندر داخل ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ عارف ہندی کی ضیا پاشیوں سے ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے :

تا نگہ را جلوہ ہا شد بے حجاب   صبح روشن بے طلوعِ آفتاب !
وادیٔ ہر سنگِ او زنار بند   دیو سار از نخلہائے سر بلند
در ہوائے او چو مے ذوق و سرور   سایہ از تقبیلِ خاکش عینِ نور
زیرِ نخلے عارف ہندی نژاد   دیدہ ہا از سرمہ اش روشن سواد
آدمے از آب و گلِ بالاترے   عالم از دیرِ خیالش پیکرے

عارف ہندی نے اقبال کو دیکھ کر رومی سے سوال کیا کہ "یہ تمہارے ساتھ کون ہے ؟ اس کی نگاہوں میں زندگی کروٹیں لیتی نظر آرہی ہے"۔ رومی نے ان الفاظ میں اقبال کا تعارف کرایا :

مردے اندر جستجو آوارۂ   ثابتے با فطرتِ سیّارۂ !
چوں عقاب افتد بصید ماہ و مہر   گرم رو اندر طوافِ نُہ سپہر
حرف با اہلِ زمیں رندانہ گفت   حور و جنت رابت و بتخانہ گفت
شعلہ ہا در موجِ دودش دیدہ ام   کبریا اندر سجودش دیدہ ام

من ندانم چیست در آب و گلش
من ندانم از مقام و منزلش

اسی ملاقات میں وشوامتر نے یہ مژدہ سنایا کہ فردائے مشرق سے وہ مایوس نہیں، کیوں کہ ایک فرشتہ کل ہی فلکِ قمر کے کوہستان سے اُترا تھا اور خاکدانِ مشرق ہی کی سمت اس کی نظریں گڑی تھیں۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ مشرق کی خاکِ خموش میں اس کو کیا نظر آرہا ہے

گفت "ہنگامِ طلوعِ خاور است   آفتابِ تازہ او را در براست

لعلہا از سنگِ رہ آید بروں یوسفانِ او زچہِ آید بروں!
رستخیزے در کنارش دیدہ ام لرزہ اندر کوہسارش دیدہ ام
اے خوش آں قومے کہ جانِ او تپید از گِلِ خود خویش را باز آفرید
عرشیاں را صبحِ عید آں ساعتے
چوں شود بیدار چشمِ ملتے!"

فلک زحل میں جب اقبال کا گزر ہوتا ہے تو وہاں اُنھیں وہ "ارواحِ رذیلہ" نظر آتی ہیں جنھوں نے "با ملک و ملت غداری کردہ و دوزخ ایشاں را قبول نکردہ" اسی کرۂ فلکی میں دو "طاغوتِ کہن" بھی دکھائی دیتے ہیں:

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن!
ناقبول و نا اُمید و نامُراد ملتے از کارِ شاں اندر فساد!
ملتے کو بندِ ہر ملت کشاد ملک و دینش از مقامِ خود فتاد!
می ندانی خطۂ ہندوستاں آں عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں
خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز درمیاں خاک و خوں غلطد ہنوز
در گِلش تخمِ غلامی را کہ کشت
ایں ہمہ کردارِ آں ارواحِ زشت

اسی جگہ آسمان شق ہوتا ہے اور ایک "حورِ پاک زاد" (مادرِ ہند) نوحہ و ماتم کرتی ہوئی نمودار ہوتی ہے:

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد پردہ از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال در دو چشمِ او سرورِ لایزال
حلّۂ در بر سبک تر از سحاب تار و پودش از رگِ برگِ گلاب
باچنیں خوبی نصیبش طوق و بند برلبِ او نالہ ہائے دردمند

رومی ان الفاظ میں اقبال سے مادرِ ہند کا تعارف کرتے ہیں:

گفت رومی "روحِ ہند است ایں ، نگر
از فغانش سوز ہا اندر جگر!

مادرِ ہند کی فغانِ جگر سوز کو بڑے موثر انداز میں اقبال نے شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

شمعِ جاں افسرد در فانوسِ ہند ہندیاں بیگانہ از ناموسِ ہند
بند ہا بر دست و پائے من از وست نالہ ہائے نارسائے من از وست
کے شبِ ہندوستان آید بروز؟ مُرد جعفر زندہ روحِ او ہنوز
تاز قیدِ یک بدن وامی رہد آشیاں اندر تنِ دیگر نہد

الاماں از روحِ جعفر الاماں!
الاماں از جعفرانِ ایں زماں!

جنت الفردوس میں طاہر غنی کشمیری سے جب اقبال کی ملاقات ہوتی ہے، تو ان کی کشمیری و برہمنی روح پوری شدت سے بیدار ہو جاتی ہے۔ اس جگہ غنی کی آڑ میں اقبال ہندستان میں "ذوقِ آزادی" پیدا کرنے کا سہرا "برہمن زادگانِ زندہ دل" (نہرو خاندان) کے سر باندھ دیتے ہیں:

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟ صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل! لالۂ احمر ز روئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامن گیر ماست مطلعِ ایں اختراں کشمیر ماست

غنی کے بعد ہندستان کے رشی شاعر 'بھرتری ہری' سے اقبال کی ملاقات ہوتی ہے، جس کے ایک سنسکرت شعر کے ترجمہ کو اقبال نے بالِ جبریل کا سر آغاز

بنایا تھا:

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر! مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر!

بھرتری ہری ہی سے ملاقات کے سلسلے میں پیرِ رومی کی زبان سے اقبال نے اپنے کو "جادوگرِ ہندی نژاد" کہلایا تھا۔ پیرِ رومی ان الفاظ میں بھرتری ہری کا اقبال سے تعارف کراتے ہیں:

زیرِ لب خندید پیرِ پاک زاد — گفت "اے جادوگرِ ہندی نژاد
آں نواپردازِ ہندی را نگر — شبنم از فیضِ نگاہ او گہر!
نکتہ آرائے کہ نامش برتری است — فطرتِ او چوں سحاب آذری است
از چمن جز غنچۂ نورس نہ چید — نغمۂ تو سوئے ما اورا کشید
پادشاہے با نوائے ارجمند — ہم بہ فقر اندر مقامِ او بلند
کارگاہِ زندگی را محرم است — او جم است و شعرِ او جامِ جم است"

مابہ تعظیمِ ہنر برخاستیم
باز باوے صحبتے آراستیم

بھرتری ہری سے صحبت میں شعر و حکمت کی باتیں ہوتی ہیں۔ اس کے بعد رومی اقبال سے کہتے ہیں کہ:

گردہ بر بزمِ درویشاں گذر — یک نظر کاخِ سلاطیں ہم نگر

اس زمرے میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ٹیپو سلطان شہید ہیں:

آں شہیدانِ محبت را امام — آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر — خاکِ قبرش از من و تو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد — تو ندانی جاں چہ مشتاقانہ داد

رفت سلطاں زیں سرائے ہفت روز
نوبتِ او در دکن باقی ہنوز

سلطان شہید اقبال سے سوال کرتے ہیں:

بازگو از ہند و از ہندوستان　　آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں!
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مُرد　　آنکہ اندر دیرِ او آتش فسرد
آنکہ دل بہر او خوں کردہ ایم　　آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم

اس کے جواب میں رومی بتلاتے ہیں:

ہندیاں منکر ز قانونِ فرنگ　　در نگیرد سحر و افسونِ فرنگ
روح را بار گراں آئینِ غیر　　گرچہ آید ز آسماں آئینِ غیر

ہندی جس "قانون فرنگ" کے منکر تھے اس کا جواباً آخر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انھوں نے اُتار پھینکا افسوس ہے کہ وہ دن دیکھنا اقبال کو نصیب نہ ہو سکا، اور حصولِ آزادی سے ساڑھے نو سال قبل وہ اس دُنیا سے چل بسے۔

حوالے

۱۔ فکرِ اقبال: خلیفہ عبدالحکیم ص: ۸۴

۲۔ ایضاً: ص: ۳۔ ۵۲

۳۔ سفرنامۂ اقبال: مرتبہ حق نواز: ص: ۹۔ ۱۰۸

سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

جاوید نامہ کا، نیز اس کے بعد شائع ہونے والے اقبال کے شعری مجموعوں کا جائزہ لینے والوں نے، ارادی یا غیر ارادی طور پر اس حقیقت سے چشم پوشی کی ہے کہ اقبال کے ان شعری مجموعوں میں ہندستان میں مسلم ریاست کے قیام کے اس تخیل کا کہیں ذکر نہیں ملتا، جس سے انھیں متہم کیا جاتا ہے، اگرچہ جاوید نامہ کی اشاعت سے دو سال قبل انھوں نے مسلم لیگ (۱۹۳۰ء) کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا کہ:

"مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندستان میں ایک مسلم ہندستان کا قیام عمل میں آئے، حق بجانب ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد کے پیچھے یہی نصب العین کار فرما ہے کہ ایک ہم آہنگ کل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اجزا کی انفرادیت کا گلا گھونٹنے کے بجائے، انھیں اس بات کا موقع دیا جائے کہ ان تمام ممکنہ قوتوں کو بروئے کار لاسکیں جو ان میں پوشیدہ ہیں!"

اقبال کے اسی بیان کو ظہور پاکستان کا سنگِ بنیاد قرار دیا جاتا ہے مگر مندرجہ بالا اقتباس میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ وہ اس دعوے کی تردید کرتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندستان میں ایک مسلم ہندستان کے قیام کی جس تجویز سے اقبال نے اتفاق کیا تھا، اس کے خالق اقبال نہیں تھے۔ بلکہ مسلم لیگ کے اجلاس (۱۹۳۰ء)

سے دو سال قبل دسمبر (۱۹۲۸ء) میں وہ تجویز اس آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں منظور کی گئی تھی جو سر فضل حسین کے ایماء سے سر آغا خان کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی تھی۔

اس اقتباس سے دوسری یہ اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اقبال نے ہندستان سے باہر نہیں، بلکہ ہندستان کے اندر "مسلم ہندستان" کے قیام کی تائید کی تھی اور وہ صرف اس کے آرزومند تھے کہ ہندستان کے "ہم آہنگ کل کے اجزائے ترکیبی کو جس کا ایک اہم جزو مسلمان بھی تھے، اس کا موقع دیا جائے کہ وہ "ان تمام ممکنہ قوتوں کو بروئے کار لاسکیں جو ان میں پوشیدہ ہیں"۔

مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں اقبال نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ شمال مغربی سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ (ریاست) بنا دیا جائے، خواہ اسے سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل ہو یا وہ اس کے باہر رہے۔ اس اسکیم کا جہاں تک تعلق ہے یہ بھی نئی نہیں تھی۔ مسلم لیگ کے جس اجلاس میں اقبال نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا، اس سے دو سال قبل یہی تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی آئی تھی۔ اور اس بنا پر مسترد ہوئی تھی کہ اگر اس صوبے کا قیام عمل میں آیا تو رقبے کے لحاظ سے یہ اتنا بڑا ہوگا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر، تصوّرِ پاکستان کے مصنّف یا موجد ہونے کا جہاں تک تعلق ہے، خود اقبال اس کے منکر تھے۔ شمالی مغربی ہند کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو ملا کر جس صوبے کے قیام کے وہ متمنّی تھے، اسے ایک علاحدہ ریاست نہیں، بلکہ ہندستانی وفاق کا حصّہ بنانا چاہتے تھے۔ یہ دونوں باتیں اقبال نے واضح الفاظ میں ایک خط میں لکھی تھیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:

۱۹۳۴ء کے اوائل میں لندن کے اخبار OBSERVER میں اقبال کے SIX LECTURES (خطباتِ مدراس) پر ایک تبصرہ شائع ہوا جو کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ ٹامسن کا لکھا ہوا تھا۔ ٹامسن اقبال کے دوست تھے اور ان سے اقبال کی خط و کتابت بھی تھی۔ ٹامسن نے اس تبصرہ میں بر سبیل تذکرہ: اقبال کو پاکستان کی اسکیم کا حامی لکھ دیا تھا۔ یہ تبصرہ پڑھتے ہی اقبال نے اسی سرعت کے ساتھ تصورِ پاکستان کا حامی ہونے سے اپنی برایت کا اظہار ضروری سمجھا، جس سرعت کے ساتھ انھوں نے زمیندار میں شائع ہونے والے مضمون کو بلا دیکھے ہوئے اس کی تردید ضروری سمجھی تھی کہ وہ کمیونسٹ خیالات رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۴ر مارچ کو مندرجہ ذیل خط ٹامسن کو لکھا۔

"ابھی ابھی وہ تبصرہ موصول ہوا جو آپ نے میری کتاب پر کیا ہے۔ یہ لاجواب ہے۔ آپ نے جو مہربانی آمیز باتیں میرے بارے میں لکھی ہیں، اُن کے لیے میں ممنون ہوں۔ لیکن آپ سے ایک چوک ہوئی ہے، جو میرے نزدیک بے حد اہم ہے۔ اس لیے فوری طور پر اس کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ نے مجھے پاکستان نامی اسکیم کا حامی کہا ہے۔ مگر اب پاکستان میری اسکیم نہیں رہی۔ اپنے [مسلم لیگ کے] خطبے میں جو اسکیم میں نے پیش کی تھی، وہ ایک مسلم صوبے کے قیام کی ہے۔ یعنی شمالی مغربی ہند میں ایک ایسے صوبے کا قیام عمل میں آئے، جس میں بھاری اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ مگر پاکستان کی اسکیم یہ ہے کہ مسلم صوبوں کی ایک جداگانہ وفاقی ریاست کا قیام عمل میں آئے، جس کی حیثیت ایک ڈومینین کی ہو، اور اس کا انگلستان سے براہِ راست رشتہ ہو۔ یہ اسکیم کیمبرج سے شروع کی گئی ہے، اور اس کے مصنفوں کا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس کے ہم مسلم ممبروں نے ہندو، یا نام نہاد ہندستانی قوم پرستی، کی قربان گاہ پر مسلم قوم کو قربان کر دیا ہے۔[۲]"

ٹامسن کے نام اقبال کے مندرجہ بالا خط کے اندراجات کسی تشریح و توضیح کے محتاج نہیں ہیں۔ تقریباً یہی وہ زمانہ ہے جب اقبال نے اپنے چہیتے بیٹے جاوید کو نصیحت کی تھی کہ:

سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

یہ نصیحت بھی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ اقبال 'سفالِ ہند' سے باہر قدم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔

اس قضیئے کا ایک پہلو اور بھی ہے، جس کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ ایسر خط لکھنے کے بعد اقبال تقریباً چار سال زندہ رہے، ان چار برسوں میں راوی ہی میں نہیں، ملک کے اور دریاؤں میں بھی، بہت پانی بہا تھا اسی عرصے میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ ہوا، اسی ایکٹ کے تحت ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخاب عمل میں آئے، جو بہت دُور رس نتائج کے حامل ثابت ہوئے، بلکہ انھوں نے ہندستان کی تاریخ کے دھارے کا رُخ ہی موڑ دیا۔ ان انتخابی نتائج ہی کے پیدا کردہ حالات نے مسٹر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کی تشکیل جدید کی راہیں ہموار کیں۔ اسی زمانے میں اقبال و جناح کی خط و کتابت ہوئی۔ مسٹر جناح کے تو نہیں، لیکن اقبال کے خطوط شائع ہو چکے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسٹر جناح کی قیادت کو تو اقبال نے یقیناً قبول کر لیا تھا مگر مسلم لیگ پر جاگیرداروں کا تسلّط ان کے سوشلسٹ ذہن کے لیے شاید قابلِ قبول نہیں ہو سکا تھا۔

حوالے

۱- Shamloo: Speeches and Statements of Iqbal

۲- Hasan Ahmed: Iqbal, His political Ideas At Cross Road, p. 80.

ضمیمے

۱۔ شیخ عبدالقادر: اقبال: خدنگ نظر (لکھنؤ) مئی ۱۹۰۲ء

۲۔ مولانا محمد علی: ڈاکٹر محمد اقبال: ہمدرد (دہلی) اگست ۱۹۲۷ء

شیخ عبدالقادر

اقبال

(ماخوذ از خدنگِ نظر مئی ۱۹۰۲ء)

ذیل میں مسٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کی شاعرانہ لائف درج ہے جو ہمارے نامور ہم عصر شیخ محمد عبدالقادر بی۔ اے اڈیٹر مخزن کے تراوش قلم کا نتیجہ ہے۔ مسٹر موصوف کی لائف لکھنے کے لیے شیخ صاحب سے زیادہ تمام پنجاب میں دوسرا اہل قلم موزوں نہ تھا جو سخن سنجی میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ اسی لیے ہم نے موزمعر کو بار بار مجبور کیا کہ وہ اپنے قابلِ فخر دوست کے وہ شاعرانہ حالات قلم بند فرمائیں جو وقتاً فوقتاً اُن کی نکتہ سنج نظر سے گزرتے رہے ہیں۔ اس لائف کے متعلق ہمیں اتنا اور جتا دینا ہے کہ یہ پُرانے اصول تذکرہ سے بالکل جُدا گانہ ہے لیکن جدید فن بیاگرفی کا کوئی پہلو فرد گذاشت نہیں ہونے پایا ہے۔ اڈیٹر

چند سال پہلے لاہور میں ایک بزم مشاعرہ قائم تھی، اور پنجاب کے اکثر نامور شعرا اس میں غزلیں کہہ کر لاتے تھے اور دادِ سخن پاتے تھے۔ کچھ کہنہ مشق حضرات تھے جو دہلی یا لکھنؤ سے تعلق رکھتے تھے۔ یا اساتذہ دہلی و لکھنؤ کی صحبت سے مستفید ہو چکے تھے۔ کچھ نوآموز تھے جو ان حضرات میں سے کسی نہ کسی کے معترف تھے۔ مشاعرہ کیا تھا سخن وروں کا ایک خاصہ دنگل تھا پہلے تلامذہ غزلیں پڑھتے تھے اور ایک دوسرے کے استادوں پر کوئی چوٹ کر جاتے تھے اور اپنے اپنے اُستاد کو بڑھا جاتے تھے۔ پھر

اُستادوں کی نوبت آتی تھی۔ وہ بھی حریفوں کو پہچانتے تھے اور باہمی اشارے کنایہ سے رُک نہ سکتے تھے۔ یہ دل لگی شاعری کو توڑ رہی تھی، مگر مشاعرہ کے لیے باعثِ فروغ تھی۔ تماشائی جوق جوق آتے تھے اور گھنٹوں یہ تماشا دیکھتے رہتے تھے۔ اس گروہ میں کبھی کبھی ایک کثیر تعداد سرکاری کالجوں کے طلبہ کی آجاتی تھی۔ ان میں سے اکثر انگریزی تعلیم کی وجہ سے ایشیائی شاعری کے مذاق سے ناآشنا ہوتے تھے۔ مگر تقاضائے سن تھا کہ ایسے مشغلے کو دلچسپ سمجھیں۔ آتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو بُلا لاتے تھے۔ ایک دن مقابلہ سخن گستری حدِ جدال پر پہنچنے کو تھا کہ اچانک طلبہ کے گروہ میں سے ایک نوجوان اُٹھا۔ عمر بیس سے کچھ متجاوز ہو گی۔ رواج وقت کے مطابق داڑھی چٹ۔ موچھیں بڑھائی ہوئی۔ لباس نئے اور پرانے فیشن کے بین بین۔ سیدھا اُس کرسی کی طرف بڑھا جس پر بیٹھکر شعرا غزل خوانی کرتے تھے۔ اور بیٹھتے ہی یہ مطلع پڑھا۔

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

مطلع کا پڑھنا تھا کہ کئی سخن آشنا کان متکلم کی طرف لگ گئے۔ اور کئی آنکھیں اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ مشاعرہ میں یہ رسم تھی کہ دبیر مجلس ہر سخن ور کی تعریف کرکے اُس سے حاضرین کی شناسائی کرا دیتا تھا۔ مگر اس نوجوان منچلے شاعر سے خود دبیر مجلس ناواقف تھا۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ پہلے حضرت کی تعریف تو فرمایئے۔ نوجوان شاعر نے کہا "لیجیے میں خود عرض کیے دیتا ہوں کہ میں کون ہوں۔ خاکسار کو اقبال کہتے ہیں۔ اور یہی میرا تخلص ہے۔ سیالکوٹ کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے سرکاری کالج میں بی۔ اے کی جماعت میں پڑھتا ہوں۔ حضرت داغؔ سے تلمذ کا فخر حاصل ہے۔ یہاں کے کسی بزرگ سے نہ خصوصیت ہے نہ خصومت۔ چند شعر لکھ کر لایا ہوں اگر اجازت ہو تو پڑھ سُناؤں۔"

مختلف آوازیں آئیں کہ فرمایئے فرمایئے۔ اور ہمارے نوجوان شاعر نے غزل کے باقی شعر پڑھنے شروع کیے۔ قریب قریب ہر شعر پر بیساختہ داد ملی۔ یہاں تک کہ اس شعر تک پہنچا:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا ارشد گورگانی دہلوی تشریف رکھتے تھے بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھے اور بولے "میاں اقبال اس عمر میں۔ اور یہ شعر!" اور واقعی اس رنگ کی کہنے والے کی عمر اور وضع سے توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ غرض اس طرح غزل ختم ہوئی اور مقطع میں شاعر نے دہلوی اور لکھنوی پارٹی کے جھگڑے پر اپنے خیال کا اظہار نہایت خوبی سے کر دیا۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس جھگڑے کے متعلق اہل پنجاب کا جو دونوں مقامات کے اصحاب فن کے خرمن کے خوشہ چیں ہیں، یہی مسلک ہونا چاہیئے۔ مقطع یہ تھا ؎

اقبال لکھنؤ سے نہ دلی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

یہ پہلا موقع تھا کہ لاہور کے سخن دانوں کو اس ابھرتے ہوئے شاعر سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد کبھی کبھی مشاعرہ ہوتا رہا۔ اور سخن فہم حضرات اقبال کی غزلوں پر پسندیدگی کا اظہار کرتے رہے لیکن کچھ تو رفتہ رفتہ مشاعرے کی گرم بازاری نہ رہی، کچھ امتحانات وغیرہ نے کالجوں کے طلبہ کو مصروف کر دیا، اور کچھ عرصے کے لیے اقبال کی طباعی کا چرچا گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبہ اور ان کے ملنے والوں تک محدود ہو گیا پہلا عام جلسہ جس میں دوستوں کے اصرار نے اقبال کو پبلک کے روبرو کھینچ بلایا انجمن حمایت اسلام کا عظیم الشان جلسہ بابت ۱۸۹۹ء تھا جہاں اس نے "نالۂ یتیم" کے عنوان سے ایک دل گداز نظم پڑھی۔ یہ نظم ایسی مقبول ہوئی کہ جلسے میں بار بار

اُس کے پڑھنے کی فرمائش ہوئی تھی اور اس پر یتیم خانے کے لیے چندے کی بارش ہو رہی تھی۔ اس نظم نے اس شہرت کی بنیاد رکھی جواب اطرافِ ہند کو گھیرتی جا رہی ہے۔ اس سے قبل خود کارکنانِ انجمن کو ان کے نام اور جوہر سے یہاں تک ناواقفیت تھی کہ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ شیخ محمد اقبال صاحب اقبال ایم۔ اے پاس کر چکے ہیں یہ قیاس کر لیا کہ وہ نظم انگریزی فرمائیں گے اور پروگرام میں اُن کے نام کے مقابل نظم انگریزی چھاپ دیا۔ اُن کے احباب کو یہ کیفیت دیکھ کر ہنسی آئی۔ مگر انھوں نے کہا کہ خیر لوگ خود ہی دیکھ لیں گے کہ کم از کم اس شخص کی حالت میں انگریزی خوانی مذاقِ زبان اور علومِ مشرقیہ کے پڑھنے میں سدِّ راہ نہیں بنی۔ اور ایسا ہوتا بھی کیوں۔ کیونکہ اس کی انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی علومِ مشرقیہ کی تعلیم میں بھی پوری کوشش کی گئی تھی۔ اور وہ اُن چند آدمیوں میں ہیں جو اعلا درجے کی انگریزی دانی کے ساتھ فارسی اور عربی سے بھی اچھی واقفیت رکھتے ہیں اور مزید لطف یہ ہے کہ سنسکرت سے بھی ناآشنا نہیں۔

نالۂ یتیم کے پڑھے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاضرینِ جلسہ جس میں پنجاب اور ہندوستان کے اکثر اضلاع سے لوگ آئے ہوئے جمع تھے۔ اپنے اپنے ہاں اُس نظم کے اثر کو لے گئے۔ اور اس دن سے آج تک نہ صرف انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے کے پروگرام میں نظمِ اقبال ایک جزوِ ضروری بن گئی ہے، بلکہ لاہور میں کوئی اور بھی عظیم الشان جلسہ بغیر نظمِ اقبال کے مکمل نہیں ہوتا۔ اپریل ۱۹۰۱ء سے رسالہ مخزن کے اجرا نے اقبال سے اخبار بین دنیا کو شناسا کر دیا ہے، اور جو کلام اُن کا اس رسالے میں شائع ہوا ہے وہ قوتِ بیان اور جوشِ سخن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی علمی معلومات کا ثبوت دے رہا ہے۔ اور صاف بتا رہا ہے کہ کہنے والا انگریزی عربی اور فارسی علم ادب پر اچھا عبور رکھنے کے علاوہ سنسکرت اور بھاشا کے علم ادب کے بھی قدر دانوں میں ہے۔ اور اپنے کلام کو ایسا گلدستہ بنا دیتا ہے۔ جس میں مختلف گلشنوں کے پھول ترتیب

سے جمع کیے ہوتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ ایسا پختہ اور وسیع مذاق پچیس چھبیس سال کی عمر میں کیونکر پیدا ہو گیا۔ ضرورت ہے کہ شیخ محمد اقبال کی ابتدائی عمر اور تعلیم اور تربیت پر مختصراً نظر ڈالی جائے۔

ہمارے خیال میں اس میں وراثت کو بھی دخل ہے اور تربیت کو بھی۔ شیخ صاحب کاشمیری الاصل ہیں اور انھیں کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم خاندان سے تعلق ہے۔ جس کی ایک شاخ اب تک وطن اصلی میں موجود ہے۔ خاندان کی وہ شاخ جس میں شیخ صاحب ہیں دو سو سال ہوئے مسلمان ہو گئی۔ گوت ان کی "سپرو" ہے اور ان کے بزرگوں کا اسلام پر ایمان لانا ایک ولی کے ساتھ عقیدت کی وجہ سے ہوا۔ جو بزرگ اول ہیں مسلمان ہوئے ان کے پوتے پنجاب میں آکر آباد ہوئے اور اس نقل مکان کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ وہ خاندان سادات کے ایک بزرگ کے بیٹے کو پنجاب کی سیر کرانے کی تقریب سے یہاں آئے اور آخر یہیں کے ہو رہے ؎

غربت کے مشغلوں نے وطن کو بھلا دیا
خانہ خراب خاطرِ الفت شعار کا

اس حکایت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اہل اللہ سے ارادت اور مشائخ اور اولیا کی نسبت حسنِ عقیدت اس خاندان کی طبیعتوں کا جزو ہو چکے ہیں اور اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ شیخ محمد اقبال کے والد اگرچہ اُمّی ہیں مگر تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اور صوفیاء کے اکثر حالات پر حاوی ہیں اور ان کے اقوال انھیں یاد ہیں۔ یہ موروثی مذاق ہمارے نوجوان شاعر میں بھی موجود ہے اور اس کی شاعری کا ضروری جزو بن گیا ہے۔

شیخ محمد اقبال کے زمانہ تعلیم میں کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہو۔ اکثر مسلمان بچوں کی طرح کچھ دنوں مکتب کی ہوا کھائی۔ پھر مدرسے

یں داخل ہوئے انگریزی شروع کی پھر کالج کے مدارج میں پہنچے اور زینہ بزینہ چڑھتے گئے۔ ہاں مدرسے میں پڑھنے اور سیالکوٹ کالج میں ایف اے کے درجے میں تعلیم پانے کے متعلق یہ جتانا ضروری ہے کہ وہاں ایک استاد مشفق کی توجہ خاص نے ان کی طبیعت اور مذاق کے بنانے میں معتدبہ حصہ لیا۔ سیالکوٹ کے اسکاچ مشن کالج کو حُسنِ اتفاق سے زبان عربی اور فارسی کی تدریس کے لیے ایک ایسے بزرگ دستیاب ہو گئے ہیں جن کی ذات نہ صرف اس تعلیم گاہ اور شہر سیالکوٹ کے لیے بلکہ پنجاب بھر کے لیے مغتنمات سے ہے۔ نام نامی اُن کا مولینا سید میر حسن صاحب ہے اور اعلا درجے کے با مذاق اصحاب میں ہیں۔ علم اور اہلِ علم کے شیدائی، ذوق کلام کے فدائی اور جویا۔ مولوی سید میر حسن اب تک ایسے طالب علم ہیں کہ۔ جو ملے۔ جہاں ملے۔ جس سے ملے، اور جب ملے، حاصل کرتے جاتے ہیں اور چھوڑتے نہیں۔ اس بات کا نتیجہ یہ ہے کہ جس شخص کو ان کی صحبت سے فیض پہنچا ہے وہ کچھ بن کے نکلا ہے۔ متعدد ہندو نوجوان اُن کے شاگردوں میں ایسے ہیں جو اردو فارسی تو خیر معمولی بات ہے، عربی زبان میں اعلا درجے کا مذاق لے کر نکلے ہیں اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں مسلمانوں سے بڑھکر نمبر پا گئے ہیں۔ مولوی صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر کسی شاگرد کو ہونہار دیکھیں تو اسے معمولی درسِ تعلیم تک محدود نہیں رہنے دیتے۔ بلکہ خارج از وقت مدرسہ اُسے بعض دلچسپ اور مفید کتابوں پر عبور کرا دیتے ہیں۔ پس جب سید میر حسن جیسے اُستاد کو اقبال سا شاگرد مل گیا۔ تو اُنھوں نے کوئی دقیقہ ان جوہروں کو جلا دینے میں جو قدرت نے طبیعت میں امانت رکھے تھے اٹھا نہیں رکھا۔ سیّد صاحب کا خاصہ تھا کہ باوجود خود ذوقِ شعر میں سرشار ہونے کے اکثر طلبہ کو شاعری سے روکتے تھے۔ مگر اقبال کی طبیعت کا اندازہ اُنھوں نے شروع سے ہی کر لیا تھا۔ اور اس کے ذوق شعر کی قدرتی ترقی کو چپکے چپکے دیکھتے گئے۔ اور کبھی اُس کے گھٹانے کی کوشش نہیں

کی ۔ شعر کا شوق تو اقبال نے بچپن سے پایا تھا ۔ اس کے والد کی زبانی ایک دوست کو معلوم ہوا ہے کہ بچپن میں جو پیسے جیب خرچ کے لیے گھر سے ملتے تھے اُن کے منظوم قصے خرید لاتا تھا اور زبانی یاد کر لیتا تھا ۔ مگر سید میر حسن صاحب کے فیضانِ صحبت کے زمانے میں اس شوق کو بے حد ترقی ہوئی ۔ سید صاحب کو بے شمار اچھے اچھے شعر اساتذہ کے زبانی یاد ہیں ۔ جو شعر وہ پڑھتے ۔ اقبال اُسے لکھ لیتا اور یاد کر لیتا ۔ دیوان غالب سبقاً اُن سے پڑھا اور " ناصر علی ہندی " کے دلآویز فارسی شعر بھی اسی زمانے میں نظر سے گزرے ۔

امتحان انٹرنس پاس کرنے کے بعد اقبال نے جناب نواب فصیح الملک نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی اُستاد حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ سے بذریعہ خط وکتابت تلمذ کی ٹھہرائی ۔ اور کچھ عرصے تک غزل میں اُن سے اصلاح لیتے رہے ۔ جب سے نئے رنگ میں مخمس اور مسدس اور ترجیع بند لکھنے شروع کیے ہیں اُس وقت سے خود اپنی اصلاح کرنے لگے ہیں ۔ گو طبیعت کی روانی بسا اوقات نہایت عجلت میں شعر زبان سے نکلواتی ہے اور کبھی اپنے شوق اور کبھی احباب کی فرمائش سے وہ قلم بند بھی ہو جاتے ہیں ۔ مگر اکثر یہ ہوتا ہے کہ وہ مہینوں کھٹائی میں پڑے رہتے ہیں ۔ جب ذرا فرصت ملی اُنھیں پڑھا ۔ اور جہاں کوئی لفظ کھٹکا تھوڑی اصلاح کر دی ۔ پھر پڑھا اور پھر کہیں کچھ کر دیا ۔ کبھی بہت ضرورت محسوس ہوئی تو کسی بامذاق دوست کے سامنے پڑھ کر اُس کی تنقید سُن لی اور اگر کچھ کام کی بات تنقید میں مل گئی تو اُس سے فائدہ اُٹھا لیا ۔

جس سال حضرت داغ سے اصلاح لینے کا سلسلہ شروع ہوا ۔ اُسی سال اقبال کی زندگی میں ایک اور واقعہ پیش آیا جسے ہمارے اہلِ ملک عموماً معمولی سمجھتے ہیں مگر جس کا ہر شخص کی زندگی پر عظیم الشان اثر پڑتا ہے ۔ یعنی ان کی شادی ہو گئی ۔ پنجاب

کے ایک معزز خاندان میں انھیں نسبت فرزندی حاصل ہوئی۔ گو بظاہر یہ تعلق بہمہ وجوہ جانبین کے لیے مفید اور مناسب تھا مگر چونکہ یہاں رشتہ داریاں نوعمر لڑکوں کی استصوا کے بغیر ہی کر دی جاتی ہیں۔ اس لیے شیخ محمد اقبال باعتبار شادی بہت خوش قسمت ثابت نہ ہوئے۔ اور اس واقعے نے طبیعت کی بشاشتی اور شگفتگی کو اُداسی سے بدل دیا۔ انھیں ایّام میں ایک پیارے دوست کے انتقال نے غم کی آگ پر اور تیل ڈال دیا۔ اور طبیعت کا رنج اشعار سے ٹپکنے لگا اور اس درد نے شاعری کا وہ حصہ عطا کر کے جسے گداز کہتے ہیں اقبال کو پورا شاعر بنا دیا۔ ہندوستان میں شاعری کی ستہّ ضروریہ میں لاگ یا لگاؤ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ حالی جیسے متین شاعر نے اسے "چیز وہ مضمون سمجھانے والی"، لکھا ہے۔ اور دیگر اساتذہ نے بھی کسی نہ کسی رنگ میں کسی نہ کسی کے ساتھ لگاؤ پیدا کیا ہے اور اس سے کلام میں واقفیت اور جوش کی چاشنی پیدا کی ہے جس کے بغیر کلام پھیکا رہ جاتا ہے۔ ہمارے اقبال بھی اس سے خالی نہ رہے کسی کی شوخی کے قائل ہوئے اور کلام میں رندانہ رنگ کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اور بہت سے معاملے کے اشعار نکلنے لگے۔ یہ رنگ اب تک باقی ہے۔ مگر فلسفہ کا رنگ اس پر غالب آجاتا ہے۔ طبیعت فلسفیانہ پائی تھی۔ اس لیے بی۔ اے کے امتحان میں فلسفہ کا مضمون لے کر پاس ہوئے۔ بعد میں ایم اے میں بھی فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا۔ اور اس شوق کا زیادہ تر باعث یہ تھا کہ اس زمانے میں مسٹر ٹی ڈبلیو، آرنلڈ صاحب جو علی گڑھ کالج کے مشہور پروفیسر تھے گورنمنٹ کالج لاہور میں چلے آئے۔ فلسفہ دانی میں ان کی شہرت عالمگیر ہے۔ محتاج بیان نہیں۔ اور اس شہرت نے اقبال کو بے اختیار اپنی طرف کھینچا۔ مگر قابل ذکر یہ امر ہے کہ شاگرد کی طبیعت یہاں بھی شفقت اُستاد کے لیے اچھا خاصہ مقناطیس ثابت ہوئی۔

جادو عجب نگاہِ خریدار دل میں تھا
بکتا ہے ساتھ بیچنے والا بھی مال کے

خود آرنلڈ صاحب بھی اقبال کی تیز فہمی اور اُس کے فلسفیانہ دماغ کے معترف ہوگئے اُنھوں نے اُسے شاگردی کے مرتبت سے رفتہ رفتہ دوستی کے اعزاز تک پہنچا دیا ہے اور اقبال کے بہترین دوستوں اور عنایت فرماؤں میں ہیں۔ وہ ایک دفعہ فرماتے تھے کہ ایسا شاگرد اُستاد کو محقق بنا دیتا ہے اور محقق کو محقق تر۔ کئی مسئلے دورانِ تعلیم میں ایسے آئے جن کی تحقیقاتِ مزید کی غرض سے آرنلڈ صاحب بہادر کو یورپ کے نامور فلسفہ دانوں سے خط وکتابت کرنی پڑی۔ اور یہ خط وکتابت اُستاد و شاگرد دونوں کے لیے مفید ثابت ہوئی۔ فلسفہ کے شوق کا یہ بھی نتیجہ ہوا کہ اقبال کچھ دنوں ہندو فلسفے کے مطالعے میں مستغرق رہا۔ اور اُس نے ایک دوست کو بتایا کہ اس فلسفے کے مطالعے سے طبیعت میں ایک قسم کا سکون محسوس ہونے لگا اور شانتی کے معنی سمجھ میں آگئے۔ اور اسی سبب سے اب مذہب میں تعصب کی گنجائش نہیں رہی اور سب مذاہب کی دل سے تعظیم کرتے ہیں اور ان کو بھلا جانتے ہیں۔ مگر یہ بھلا جاننا اپنے مذہب کے عشق کے منافی نہیں گو میدانِ عمل میں ابھی صفِ عشاقِ مذہب میں نہیں آسکے۔

ایم۔ اے پاس ہونے کے بعد شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ و فلسفہ و سیاستِ مدن کے مضامین پر لکچر دینے کے لیے مقرر کر دیے گئے۔ اس عہدے کی میعاد دو سال ہوتی ہے۔ اب وہ دو سال ختم ہو چکے ہیں۔ مگر افسران کالج ان کی خدمات کو ایسا قیمتی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے توسیع میعاد کے لیے سفارش کی ہے اور اُنھیں غالباً اور دو سال کے لیے وہاں رہنا ہوگا۔ اس کے بعد یا اسی اثنا میں اغلب ہے کہ اُنھیں صیغۂ تعلیم میں کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ کیونکہ اکثر

عہدہ داران تعلیم کی رائے ان کی نسبت اچھی ہے۔ اور وہ ان سے تعلیمی خدمت لینے کے خواہشمند ہیں۔ آج کل علمی مشاغل میں انہماک ہے۔ نثر میں مضمون سیاست مدن پر ایک بیش بہا اور جامع کتاب زیر تصنیف ہے۔ اور نظم میں عموماً انگریزی شعرا کی طرز پر معنی خیز نظمیں لکھتے ہیں جنمیں سے اکثر بذریعۂ مخزن اشاعت پا چکی ہیں۔ فرمائشی کلام سے بہت گھبراتے ہیں۔ اور کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ محض فرمائش سے شعر کہہ دیں اور حقیقت یہی ہے کہ شعر وہ چیز نہیں کہ کسی کے اصرار سے ہو جائے۔ یہ تو طبیعت کا ایک بے اختیار جوش ہے اور دل کا اُبال ہے۔ اور پورا لطف اسی میں ہے کہ بیساختہ زبان پر جاری ہو۔

اقبال کے حالاتِ زندگی کے اس مختصر خاکے کو ختم کرنے سے پہلے شاید بے جا نہ ہوگا کہ اس کے کلام پر نگاہ ڈالی جائے۔ اقبال کا کلام ابھی کمیّت میں اکثر مشہور شعرا کے برابر نہیں پہنچا۔ مگر کیفیت میں انداز خاص رکھتا ہے۔ اول تو بھرتی کے اشعار اس کے کلام میں کم پائے جائیں گے۔ بقول داغ ع "اس کے ہر شعر میں ترکیب نئی بات نئی" نظر آتی ہے۔ غزل کے اکثر اشعار واقعیت کا رنگ لیے ہوتے ہیں اور تصنع ان میں بہت کم نظر آتا ہے۔ مگر طبیعت اپنے جوہر اصلی مسلسل نظموں میں دکھاتی ہے۔ گو اُن میں بعض بند مشکل پسندی کے نمونے ہیں۔ کئی سخن فہم حضرات نے اس مشکل پسندی پر اعتراض کیا ہے۔ اور ایک حد تک یہ اعتراض بجا بھی تھا۔ مگر اس کا اثر اقبال کی طبیعت پر ابتدا میں اچھا نہیں پڑا۔ بجائے اس کی اصلاح کی فکر کے اس کا قصد ہوا کہ شعر گوئی ترک کر دے۔ چنانچہ ایک دو بے تکلف دوستوں کے روبرو اس خیال کا اظہار بھی کر دیا۔ مگر انھوں نے سمجھایا کہ اگر کہیں ایک شعر ایسا نکلتا ہے جس پر کوئی درست اعتراض وارد ہو سکے تو دس ایسے نکلتے ہیں جن کی خوبی کو سب مانتے ہیں اور ترک شعر گوئی ملک کی شاعری کو نقصان رساں ہوگا اور اسی زمانے

میں دور دور سے دادیں آنے لگیں۔ منجملہ دیگر اصحاب کے مولینا شبلی نعمانی جیسے نکتہ رس مشہور عالم نے بدین الفاظ داد دی کہ "جب آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ آپ کو ڈھونڈھیں گے۔" ان باتوں نے اقبال کی ہمت پھر بندھا دی۔ اعتراض کا ایک حصہ جو اختیاری تھا رفع ہو جاتا ہے۔ اور اب پہلے سے زیادہ ایسے اشعار اقبال کے قلم سے نکلتے ہیں جو زور کے ساتھ سادگی اور سلاست کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہوتے ہیں۔ مگر اعتراض کا ایک حصہ غیر اختیاری تھا اور وہ رفع نہیں ہوا اور نہیں ہو سکتا۔ اردو زبان بھی بمقابلہ انگریزی کے ابتدائی حالت میں ہے انگریزی شاعری میں اور خصوصاً فلسفہ میں اکثر خیالات ایسے ہیں جو موجودہ اُردو الفاظ اور سیدھی سادھی ترکیبوں سے ادا نہیں ہو سکتے اور ان کے لیے کسی قدر مشکل عربی فارسی الفاظ کی ضرورت ہے یا ذرا پیچیدہ ترکیبوں کی۔ اس لیے ع "اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے" ایک طرف تو شاعر اپنے سامعین کی طرف جھکے اور اُن کی سطح پر اترنے کی کوشش کرے، اور اس سے زیادہ سامعین اپنے مذاق کو بڑھائیں اور معلومات کو وسیع کریں اور اس کی بلند پروازی کا تتبّع کریں۔ اصل اندازہ تو کسی کے کلام کا اُس کے بعد کی نسلیں لگاتی ہیں اور اس لیے اس کے معاصرین کے لیے موقع صحیح اندازے کا نہیں ہو سکتا۔ مگر اتنا کہنے میں ہمیں تامل نہیں کہ جو کچھ اقبال نے اب تک لکھا ہے وہ اس اعتبار سے کہ ایک نوجوان انگریزی خوان کا کلام ہے جس نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ علوم انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا ہے اور جسے اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ نہیں، نہایت بے بہا ہے اور اُس حصۂ ملک کے لیے جسے اب وہ اپنا وطن کہتا ہے مایۂ فخر و ناز ہے۔

'عبدالقادر'

مولانا محمد علی

ڈاکٹر محمد اقبال

۱۹۲۶ء کے اواخر میں اقبال پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں بعد لاہور میں فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ اس سلسلے میں مقامی ہندوؤں اور مسلمانوں کے وفد، جدا جدا، ڈپٹی کمشنر سے ملے اور فسادات کے تدارک کے لیے انتظامی عہدوں پر ہندستانی افسروں کی جگہ انگریز افسروں کو مامور کیے جانے کی درخواست کی۔ مسلمانوں کے وفد میں ڈاکٹر اقبال بھی شامل تھے اور اس تجویز سے وہ اس حد تک متفق تھے کہ کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے وہی تجویز پھر دہرا دی۔ حزب اختلاف کے ممبروں نے اس کے خلاف جب "نہیں نہیں" کی آواز بلند کی تو ان کے احتجاج کو اقبال نے حقارت کے ساتھ "جھوٹی قوم پروری" سے اور "کڑک مرغی کی کڑکڑاہٹ" سے تعبیر کیا۔

ٹائمز (لندن) کے نامہ نگار شملہ نے اقبال کی اس تقریر کو خوب اچھالا محمد علی کو اس قصے کی تفصیل بھی ٹائمز ہی سے معلوم ہوئی، جسے پڑھ کر وہ تلملا اٹھے اور اپنے مخصوص انداز میں انھوں نے اقبال کے سیاسی افکار و اعمال کا جائزہ لے ڈالا، جو ان کے اخبار روزنامہ ہمدرد کی پانچ قسطوں میں شائع ہوا۔ ذیل میں ان مضامین کے سیاسی اجزا کی تلخیص بلا تبصرہ پیش کی جا رہی ہے۔ [ع۔ ص]

(مرتب)

میرا اُستاد اقبال

"اس ہفتے کی ولایتی ڈاک مجھے ہفتے کی شب کو ملی .... دن بھر کام کر کے تھک گیا تھا۔ سونے کو لیٹا تو سرہانے ڈاک رکھی تھی .... اسی وقت آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا، اور جو اقتباسات برطانوی اخبارات کے آئے تھے، اُن کو ترتیب دی ..... ہندستان کے چھوٹے چھوٹے فساد کی خبریں تھیں۔ کٹنگز کیا تھے، ہندو مسلم اتحاد کی دھجیاں تھیں جو اُڑا ئی گئی تھیں۔ ہندستان جیسے وسیع ملک میں روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ مگر ولایتی اخبارات میں مہینے بھر میں مشکل سے دو چار سطریں ہندستان کے متعلق شائع ہوتی ہیں، اور رائٹر تک اس سے زیادہ تار پر بھیجنے کو فضول خرچی سمجھتا ہے۔ لیکن ایک طویل خبر جو باریک ٹائپ میں مشکل سے ایک کالم میں سمائی، شملہ سے اسی دن تار پر بھیجی گئی تھی .... تھکا تھکایا نیند سے مخمور ہمدرد کا غریب اڈیٹر مجبور ہو گیا کہ شملہ کی اس خبر کو پڑھے۔ پڑھا تو پنجاب کونسل کا وہ مباحثہ تھا جو ...... ایک سکھ رکن کی اس تحریک پر ہوا تھا کہ تمام عہدے کھلے ہوئے مقابلے کے ذریعے سے اُمیدواروں کو دیئے جائیں، یا ایسے انتخاب کے ذریعے جس میں ذات پات، مذہب اور رنگ کا کچھ لحاظ نہ رکھا جائے۔ میں نے ہندستان ٹائمز میں اس

مباحثے کی رپورٹ پڑھی تھی، اور یہ بھی پڑھا تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے تو غضب ہی کیا تھا کہ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ہندستانیوں کی جگہ انگریزوں کو مقرر کیا جائے۔ لیکن ان کی پوری تقریر میں نے کسی جگہ نہیں پڑھی تھی، اور میرا یہ گمان تھا کہ اس اخبار کے نامہ نگار نے غلط فہمی سے یہ قول ان سے منسوب کر دیا تھا۔ اس وقت بھی ان کی پوری تقریر میرے سامنے نہ تھی، لیکن اس کے چند زہر آلود فقرے اس تار میں درج تھے۔ ان کے پڑھتے ہی میری نیند غائب ہوگئی اور میرے قلب کو اس قدر سخت دھچکا لگا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال اس وقت نظر بند نہیں تھے جب کہ جنگ عمومی [پہلی جنگ عظیم] میں ہم میں سے بہت سے نظر بند کر دیے گئے تھے۔ وہ اس جنگ کے بعد بھی مارشل لا کے زمانے میں قید نہیں ہوئے تھے، حالانکہ خود پنجاب میں بعض بڑے سے بڑے ہندو اور مسلمان قید کر دیے گئے تھے اور عوام میں سے تو سینکڑوں ہی جیل خانوں میں بھر دیے گئے تھے۔ خلافت کے لیے مسلمانانِ ہندستان نے یورپ کو ایک وفد بھیجا، جس کا سرگروہ میں تھا تو ڈاکٹر صاحب کو اس قدر غیرت آئی، اور اس غیرت کو میں بجا سمجھتا تھا کہ انھوں نے دریوزۂ خلافت کے نام کا قطعہ لکھا، جس میں ارشاد فرمایا کہ:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

.....

لیکن جب دریوزہ گرانِ خلافت، خالی ہاتھ کاسۂ گدائی لے کر یورپ سے لوٹے مگر اس کا تہیہ کر کے کہ یہ اتمام حجت تھا، اس کے بعد یورپ کے سامنے ہرگز ہاتھ نہ پھیلائیں گے .... اگر قوت ہوگی تو کھلا ہاتھ نہ بڑھے گا بلکہ بندھی ہوئی مٹھی سے کام لیا جائے گا، تو مہاتما گاندھی نے ترکِ تعاون کی تحریک شروع کر دی تھی اور خلافت اور پنجاب کے مظالم ہی اس تحریک کی بنا تھے۔ الحمدللہ کہ مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کے طلبہ نے اس دعوت پر فوراً لبیک کہا .... ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی، تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اس سے اندازہ کیا کہ طلبہ کس قدر مستعد ہوں گے۔ مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب سکرٹیری تھے اور آپ نے جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا (نہ کہ کسی مولوی سے) ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پہلے علمائے کرام کا فتوا لے لیا جائے۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتوا صادر فرما دیا۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی، البتہ اجتہاد فرمایا تو علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے اس وقت جب کہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کر لائے، اور یہ اجتہاد یہ تھا کہ ایک ٹکنالوجیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے جو ہندستانیوں کو ٹھیک اس وقت صنعت و حرفت سکھانا شروع کرے، جب کہ ہم لوگ پوری جد و جہد کر کے انگریزوں سے سوراج لینے کے لیے بیتاب و بے قرار تھے۔ ’شکوہ‘ اور ’جواب شکوہ‘ ’اسرارِ خودی‘

رموزِ بے خودی، کا مصنّف اور ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کا نسخہ! یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز شے تھی کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اپنے کسی مریض سے کہتے کہ "جاؤ ٹونا چماری سے جھاڑ پھونک کرالو اس طرح سے بچ سکتے ہو، ورنہ بس اب تمہارا خاتمہ ہے"۔ اس کے بعد پھر پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور اگر اس سے پہلے حسرت کا قول صحیح نہ تھا تو اب ضرور صحیح ہوگیا کہ:

آج وہ ننگ جوانی ہے جو زنداں میں نہیں

مگر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب، ٹکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ والے طبیب حاذق، انارکلی میں بیٹھے 'پیام مشرق' لکھتے رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بیجاپور کے جیل خانے میں 'اسرار و رموز' پڑھا کرتا تھا اور رویا کرتا تھا اور 'اقبال مرحوم' کے لیے اسی کے الفاظ میں دعا کیا کرتا کرتا تھا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب کو میں 'اقبال مرحوم' اسی زمانے سے کہنے لگا اور اُنھیں میں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے سینکڑوں اشعار جو مجھے یاد تھے، جب کبھی بیجاپور کے جیل خانے میں یاد آجاتے تھے تو قلب پر وہی اثر ہوتا تھا جو کسی ایسے خاندان والوں کے قلب پر ہوتا ہے جن کی ایک چہیتی لڑکی کسی شرم ناک فعل کے ارتکاب کے باعث گھر سے نکل گئی ہو اور اُنھوں نے خاندانی عزت و آبرو کی تباہی کے باعث اسے دل سے بھلانے کی کوشش کی ہو اور اتفاقیہ اس کے اوڑھنے یا پہننے کی کوئی چیز نکل آئے اور یکایک ان کی نظر اس پر پڑ جائے۔ محبت اور کشمکش اور شرم دونوں کی کشمکش سے زیادہ

دل پر چوٹ لگانے والی کون سی جنگ ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی جب میں اپنے اُستاد (شاعری کے نہیں، مذہبِ اسلام کے اُستاد) اُقبال مرحوم کے متعلق کچھ لکھ رہا ہوں، میرا دل ان کی محبت کے باعث تڑپ رہا ہے اور میرا دماغ میرے قلم کی مہمیز اور چابک دونوں سے تواضع کر رہا ہے کہ اگر قدم ذرا بھی سست پڑا تو کھال ادھیڑ دی جائے گی۔ حق پرستی کے میدان میں قدم کا ذرا بھی سست پڑنا اگر لیٹے۔ یا تو یا باطل کی طرف لوٹ جانے سے کچھ ہی کم گناہ ہے۔ کاش اقبال، ہمارا محبوب و معشوق اقبال، ہم کو اس دورِ ارتداد میں اسلام کی صراطِ مستقیم دکھانے والا اقبال، ہمارے ساتھ کسی جیل خانے میں ہوتا۔ کیا ہمارے بیتول جیل خانے سے نکل کر سیدھے امرت سر کانگریس میں آکر شریک ہونے پر اقبال ہی نے یہ اشعار نہیں لکھے تھے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

بیتول کی قید کے زمانے میں تو پھر بھی صرف چند ہی مسلمان اور ہندستانی اس سعادت سے مشرف کیے گئے تھے۔ لیکن کراچی کے مقدمے کے بعد تو پچیس تیس ہزار اس سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے ... لیکن اقبال اس وقت بھی آزاد رہے اور ... اس بار جو ہم جیل خانے سے چھوٹے تو اقبال مرحوم، ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ اس کے بعد کس نظم کی ان سے توقع کی جا سکتی تھی، اور ان کے لیے سوائے دام اقبالہم کے کس چیز کی دعا کی جا سکتی تھی! بہ قول ان ہی کے اب تو یہی کہا جا سکتا ہے:

چیست یاران بعد ازیں تدبیرِ ما!
رُخ سوئے میخانہ دارد پیرِ ما

(ہمدرد: ۱۴ر اگست ۱۹۲۷ء)

طبیبِ حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ

"ہمدرد" مورخہ ۱۴ر اگست میں ہم نے لندن ٹائمز کے شملوی نامہ نگار کے اس طول طویل تار کا ذکر کیا تھا جو اس نے پنجاب کونسل کے مباحثے کے متعلق ۱۹ر جولائی کو روانہ کیا تھا، جس میں سر محمد اقبال کے وہ زہریلے فقرے، جو انھوں نے اپنی تقریر کے دوران میں قوم پروروں پر کسے تھے، پہلی بار میری نظر سے گزرے، حسبِ عدہ آج میں ان فقروں کو جو ۲۰ر جولائی کو نذرِ قارئین لندن ٹائمز ہو چکے ہیں، نذرِ قارئین "ہمدرد" بھی کرتا ہوں، اور نیز ان خیالات کو بھی جن کا ان فقروں پر ٹائمز کے شملوی نامہ نگار نے اظہار فرمایا ہے ... تار کے اس حصے کی سُرخی "جھوٹی قوم پروری" ہے اور نامہ نگار موصوف اس کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ قابلِ ذکر بیان ڈاکٹر سر محمد اقبال کا تھا جو ایک ممتاز، آگے کی کرسیوں پر بیٹھنے والے اور معتدل خیالات کے مسلمان ہیں اور ایک ایسے شاعر ہیں کہ سارے ہندستان میں ان کا شہرہ ہے ... نامہ نگار رقم طراز ہے کہ ڈاکٹر موصوف نے ارشاد فرمایا کہ لاہور کے حال ہی کے فسادات کے بعد مسلمانوں نے ایک وفد ڈپٹی کمشنر کے پاس، جو ضلع کا مجسٹریٹ ہے، اس غرض سے بھجوایا کہ پولیس جن ہندوؤں سے تفتیش

کر رہی تھی اُن کے خلاف مسلمانوں کی بے اعتمادی کا اظہار کیا جائے اور ہندوؤں نے بھی ایسا ہی وفد مسلمان تفتیش کنندگان کے خلاف بے اعتمادی کے اظہار کے لیے بھجوایا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر موصوف نے فرمایا کہ میں بھی مسلمانوں کے وفد کے ساتھ گیا تھا۔ مجسٹریٹ نے جواب میں فرمایا کہ اصلاحات (۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے نفاذ) سے پہلے ۱۲۰ برطانوی افسر تھے، اب صرف ۶۸ ہیں۔ تم دونوں [ہندو مسلمان] یورپین افسروں کو مانگتے ہو، لیکن ہمارے پاس تمھاری درخواست پوری کرنے کے لیے کافی یورپین افسر نہیں ہیں۔

... اس کے بعد نامہ نگار لکھتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ بعض عہدے جو پہلے برطانوی "جنٹلمینوں" کو ملتے تھے، وہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کے حصے میں آ گئے، لیکن گورنمنٹ نے جس وقت یہ تبدیلی کی، اس نے ایک بڑی غلطی کی۔ اور وہ [اقبال] مزید برطانوی افسروں کا خیر مقدم کریں گے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ اس پر قہقہوں اور تحسین کی آوازیں آنے لگیں اور ان کے خلاف چند آوازیں "نہیں نہیں" کی بھی آئیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے چلا کر ارشاد فرمایا کہ میں اس رائے کا اظہار اپنی ذمہ داری کو پوری طرح سمجھ بوجھ کر کر رہا ہوں، اور میں "نہیں نہیں" کی آوازوں کی حقیقت کو بھی خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ یہ ایک جھوٹی قوم پروری کی نمائندگی کرتے ہیں قوم پروری کا نام توفیشن کے طور اس ملک کے لوگوں کی زبان پر چند برسوں سے ہے۔ لیکن وہ اس کڑک مرغی کی کُڑکڑ دں کوں ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہے۔ نامہ نگار موصوف بھلا کیوں نہ کہے گا کہ اس

پر خوب قہقہے پڑے اور عام طور پر تحسین کی آوازیں بلند ہوئیں

میرے مسلمان اور ہندو بھائی آج اس تار کو پڑھیں اور بار بار پڑھیں، اور غور سے پڑھیں اور اس کا اصل مطلب سمجھنے کی کوشش کریں۔ کل انشاءاللہ میں بھی اس کے متعلق اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں گا، اور پھر بتاؤں گا کہ 'شمع و شاعر' کا مصنف کس طرح لندن ٹائمز کے موکلوں کا آلۂ کار بن رہا ہے۔ آج طبیب حاذق ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب سے صرف اسی قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ بھی اس تار کو پڑھ کر غور فرمائیں کہ جھوٹی قوم پروری کا الزام تو ہمارے سر آنکھوں پر، مگر کیا خود ان کی ملت پروری اس سے بہت زیادہ سچی نکلی ...؟

(ہمدرد: ۱۶ راگست ۱۹۲۷ء)

"شاعرِ وطن" اقبال

... ہماری قوم پروری پر جھوٹے ہونے کا جو الزام انھوں نے لگایا ہے، وہ ہمارے سر آنکھوں پر۔ یقیناً سیاسیین کی ایک بہت بڑی جماعت کی قوم پروری آج جھوٹی ثابت ہو رہی ہے۔ اگر ہماری قوم پروری سچی ہوتی تو مالابار کے دردناک واقعات کے بعد نہ سنگھٹن اور شدھی کی تحریکوں کو ہندو لیڈر اس طرح جذبۂ انتقام سے مخمور ہو کر شروع کرتے، نہ مسلمانوں میں لیڈری کے دعویدار اس اثر سے فائدہ اٹھا کر، جو اس جذبۂ انتقام نے عام مسلمانوں میں پیدا کیا تھا۔ تنظیم اور تبلیغ کا نام لیتے پھرتے ...

لیکن ڈاکٹر صاحب کیا سچی قوم پروری کو بھی پسند نہیں فرماتے؟

اگر وہ اپنے ابتدائی کلام پر غور فرمائیں گے تو انہیں خود اقبال کرنا پڑے گا کہ ان کے ابتدائی خیالات، ان ہی کے بعد کے اس سچّے اصول کے کہ:

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کس قدر خلاف تھے۔ کیا انھوں نے یہ "ترانۂ ہندی" موزوں نہیں فرمایا تھا جس کا مطلع ہے:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا

خیر اس بحث کو جانے دیجئے۔ مگر اقبال صاحب یقیناً ایک زمانے میں تو قوم پروری کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انھوں نے 'ترانۂ ہندی' تصنیف فرمایا... جب نیا شوالہ لکھنے کا وقت آتا ہے، تو اقبال سچّی قوم پروری کے ترجمان بن کر کیا خوب فرماتے ہیں:

...

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

اب میں اس بے مثل نظم کے لکھنے والے سے پوچھتا ہوں کہ اگر میری طرح آج اُن کا دل بھی ہندستان کی جھوٹی قوم پروری پر رات دن روتا رہتا ہے تو کیا اس کا علاج یہ ہے کہ انگریزوں سے کہا جائے کہ جو عہدے اور جو مناصب تمھاری بے نظیر فیاضی سے" ہندو مسلمانوں کے بخرے میں آگئے ہیں، مگر جو پہلے صرف برطانوی جنٹلمینوں کو ملا کرتے تھے، وہ تم پھر ہندو مسلمانوں سے لے لو، ہم مزید برطانوی

افسروں کا خیر مقدم کریں گے ...

میں نہیں کہتا کہ آپ جھوٹی قوم پروری کے دام فریب میں پھنس جائیے، مگر مالوی جی اور لالہ جی [لالہ لاجپت رائے] منجے اور کیلکر کے جال کی اس جال کے مقابلے میں حقیقت ہی کیا ہے، جو لندن سے شملہ اور شملہ سے لاہور تک پھیلا ہوا ہے۔ میں تو ہندو مہا سبھا، کے جال میں نہیں پھنسا، مگر ڈاکٹر صاحب ضرور "ٹائمز" کی اُمت کے جال میں پھنس گئے۔ میں اس کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ شاید آج بھی ڈاکٹر اقبال کو اس کا سخت قلق ہے کہ مدّت سے دل کی بستی سونی پڑی ہے۔ لیکن میں اس کا ہرگز قائل نہیں ہوں کہ اس دیس میں ایک نیا شوالہ بنایا جائے، جس میں بجائے لالہ لاجپت رائے کے مسٹر او گلوی [ڈپٹی کمشنر لاہور] کی مورتی بٹھا دی جائے۔ چاہے برہمن بُرا مانے یا بھلا، میں نہ اس کے صنم کدے کے پُرانے بتوں کو سجدہ کرنے کو تیار ہوں، نہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب دام اقبالہم کے ان نئے بتوں کو، جن کا وہ خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ میرا تو دونوں کو دور ہی سے سلام ہے ...

میں بھی ایک اونچے تیرتھ کی تلاش میں احرام باندھ چکا ہوں، اور یقیناً دنیا کے تیرتھوں سے میرا تیرتھ بھی اونچا ہے ... لیکن اس کا تو مجھے کبھی شبہ تک نہ ہوا تھا کہ اقبال کا تیرتھ فقط شملہ کی بلندی تک اونچا ہے ...

("ہمدرد"، ۱۷ر اگست ۱۹۲۷ء)

شاعرِ اسلام اقبال

میں ابتدا ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ مجھے آج کل کی سیاسی قوم پروری کے ایک بڑے حصے کے جھوٹے ہونے کا اعتراف ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہندستان آیس آج سچی چیز کیا ہے ؟ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا کچھ ابتدائی کلام نذرِ قارئین کرام کیا گیا تھا جس میں اُنھوں نے اپنے حبِ وطن کو نظم میں ظاہر فرمایا تھا۔ کل کا مضمون ختم کرنے کے بعد لیٹ گیا اور جی چاہا کہ گرامو فون پر کچھ گانا سُنا جائے ... ۱۹۱۱ء کا ایک ریکارڈ لگایا گیا ... پہلا شعر ہی ایک تیر کی طرح جگر کے پار ہو گیا:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

کیا ہندستان کے مسلمان اپنی افسردگی اور اس مردنی سے، جو آج ان پر چھائی ہوئی ہے، ثابت کر رہے ہیں کہ چین بھی ان کا ہے، اور عرب بھی ان کا، خود ان ہی کے پنجاب سے، جو ہندستان بھر میں "وطنیت" کی بدترین مثال پیش کر رہا ہے، بار بار یہ صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں کہ چین تو کہاں کا ترکی و حجاز تک سے ہمیں قطع نظر کر کے اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اور اپنے ہی ملک کی طرف متوجہ ہونے کے صرف یہ معنی لیے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کو حکومت کی کتنی ملازمتیں دلائی جائیں، اور مسلمانوں کی "قوم" کے معنی زیادہ تر یا تو اپنی ذات شریف ہے یا بیٹا، بھتیجا، بھانجا، داماد ہیں ... سچی ملت پرستی کی یہ مرغی ہرگز

کڑک نہیں ہوئی ہے۔ یہ برابر انڈے دے رہی ہے، اور پیسے بٹور رہی ہے ... یہ ہے ۱۹۰۸ء سے آج تک ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ملت پروری کا نتیجہ۔ یقیناً آج جب کہ ہندستان کے تقریباً ہر گوشے میں ہندو مسلمانوں کے فسادات نے اس کو سارے عالم میں بدنام کر دیا، یہ کہنا قطعاً جھوٹ ہے کہ:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

...

لیکن کیا یہ اس سے زیادہ سچ ہے کہ:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

چین انگریزوں کا امریکنوں کا ہے، یا جاپانیوں کا ہے، یا شاید روسیوں کا ہو جائے، یا پھر چینیوں کا (خدا کرے) ہو جائے، جن میں مسلمانوں کا بھی اچھا خاصا عنصر ہے، لیکن ہمارا تو آج ہرگز نہیں ہے۔ اور عرب انگریزوں کا ہے، یا فرانسیسیوں کا، یا یہودیوں کا، یا نجدیوں کا، اور یمینوں کا ... رہا ہندستان بہ ظاہر وہ لالہ لاجپت رائے کا ہے، اور ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب چاہتے ہیں کہ اب وہ مسٹر اوگلوی کا ہو جائے۔ طبیب حاذق کا یہ نیا نسخہ ہے، جس کا جی چاہے اسے بندھوا لائے اور گھول کر اور پیس کر یا جوشش دے کر اسے پیے، لیکن مجھ جیسے عطائی کو تو اس سے ہرگز شفا کی امید نہیں۔

(ہمدرد، ۱۹ر اگست ۱۹۲۷ء)

میں تو آج بھی اقبال، اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ... کیا تو نے

ہی ہمیں عرفی کا یہ شعر یاد نہیں دلایا تھا:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر خواں چو محمل راگراں بینی

کیا آج بھی عرفی کی تربت سے یہ صدا نکل نہیں رہی ہے
— شکوۂ اہلِ جہاں کم گو
بس یا تو خاموش رہ یا پھر وہی راگ الاپ جس نے ہندستان کے مسلمانوں میں ۱۹۲۲ء تک دیپک کا کام کیا تھا... تو نڈر ہو کر مسلمانوں کو بیدار کر اور مسلمانوں ہی کو نہیں ہندوؤں کو بھی... فقط مسلم لیگ کو نہ جگا، کانگریس کو بھی بیدار کر:

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

(ہمدرد: ۲۷ اگست ۱۹۲۷ء)

مختصر کتابیات

اقبال : علم الاقتصاد : لاہور : ۱۹۰۳ء؛ اور جملہ مجموعہ کلام

اعجاز حسین بٹالوی : اقبال کے آخری دو سال : کراچی ۱۹۶۱
بشیر احمد ڈار : انوار اقبال : کراچی ۱۹۶۷
حسن اختر ملک : اطراف اقبال : دہلی ۱۹۷۶
حق نواز : سفرنامۂ اقبال : دہلی ۱۹۷۷ء
حمزہ فاروقی : سفرنامۂ اقبال :
خورشید عبدالسلام : سرگذشت اقبال : لاہور : ۱۹۷۷
رحیم بخش شاہین : اوراق گم گشتہ : لاہور : ۱۹۷۵
رفیع الدین ہاشمی : خطوط اقبال : لاہور : ۱۹۷۶ء
عبدالحکیم خلیفہ : فکر اقبال : لاہور : ب ت
عبدالمجید سالک : ذکر اقبال : لاہور : ب ت (۱۹۵۵)
عبدالوحید معینی و عبداللہ قریشی : باقیات اقبال : لاہور ۱۹۶۶
عطاء اللہ شیخ : اقبال نامہ (اول و دوم) لاہور ۱۹۴۵ء
محمود نظامی : ملفوظات : لاہور، ب ت
نازلی بیگم : سیر یورپ : لاہور : ب ت (قبل ۱۹۱۲ء)
وحید الدین فقیر : روزگار فقیر : لاہور
وقار عظیم : اقبال۔ شاعر اور فلسفی : لاہور : ب ت
یوسف سلیم چشتی : شرح بانگ درا : دہلی ب ت

اقبال نمبر

آج کل : دہلی : دسمبر ۱۹۷۷ء

جامعہ : دہلی : دسمبر ۱۹۷۷ء

جوہر : دہلی : ۱۹۳۸ء

نقوش : لاہور (نمبر ۱، ۲) : ۱۹۷۷ء

نیرنگ خیال : لاہور : ۱۹۳۲ء

انگریزی

Abdullah Anwar Beg: POET OF THE EAST, Lahore, 1939.

Atia Begum: IQBAL, Bombay, 1947.

Hasan Ahmad, S: IQBAL - HIS POLITICAL IDEAS AT CROSSROAD, Aligarh, 1979.

Shamloo: SPEECHES AND STATEMENTS OF IQBAL, Lahore, 1944.

Smith, W.C.: MODERN ISLAM IN INDIA, Lahore, 1943.

Tasir, M.D.: ASPECTS OF IQBAL, Lahore, 1956.